دیوانِ بیان میرٹھی

مرتبہ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

ضرب المثل رہے گا محبت میں میرا نام
آئیں گے میرے بعد فقط نوحہ خوانِ عشق

(حافظ محمد ولایت اللہ)

****



PDF By : Miskeen Mazhar Ali Khan

Cell NO : 00966590510687

Facebook Group «خاکۂ حلم» Link:

https://www.facebook.com/groups/1752899681599082/

دیوانِ بیان میرٹھی

مرتبہ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

کتاب کا نام : دیوان بیان میرٹھی
مرتب کا نام : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور۴۴۰۰۱۸
مطبع : سلمان فائن پرنٹرس، مومن پورہ، ناگپور۴۴۰۰۱۸
کمپیوٹر کمپوزنگ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور۴۴۰۰۱۸
کمپوزرس : ثاقب انجم (کامٹی، ضلع ناگپور)، محمد رفیع الدین (ناگپور)
سالِ اشاعت : ۲۰۰۷ء
تعداد : پانچ سو (۵۰۰)
قیمت : ۷۵ روپے

DEEWAN-E-BAYAN MEERATHI

Edited By **Dr. Mohammed Sharfuddin Sahil**

First Edition 2007 Price: Rs.75/-

ملنے کا پتہ

رحیم اسٹورس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور

ماہرِ غالبیات

جناب کالی داس گپتا رضا

اور

مخلص ادیب

جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ

کی نذر

جنہوں نے میری ہمیشہ ہمت افزائی کی۔

شناس نامہ

نام معہ تخلص	:	محمد شرف الدین ساحل
پتہ	:	حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور۔ ۴۴۰۰۱۸
جدامجد کا نام	:	حاجی الٰہی بخش ابن حاجی نور محمد
تایا کا نام	:	حاجی محمد عبدالمتین (وفات ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء)
والد کا نام	:	حاجی محمد یٰسین (وفات: ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء)
والدہ کا نام	:	جنن سائرہ بیگم (وفات: ۱۸ مارچ ۲۰۰۱ء)
تاریخ پیدائش	:	بروز منگل، ۲ اگست ۱۹۴۹ء، مطابق ۶ شوال ۱۳۶۸ھ
مقام پیدائش	:	مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)

تعلیم :

ایم اے (اردو)	۱۹۷۴ء	ناگپور یونیورسٹی
ایم اے (فارسی)	۱۹۷۶ء	ناگپور یونیورسٹی
ایم اے (عربی)	۱۹۷۸ء	ناگپور یونیورسٹی
بی ایڈ	۱۹۸۱ء	ناگپور یونیورسٹی
پی ایچ۔ڈی	۱۹۷۷ء	ناگپور یونیورسٹی
پی ایچ۔ڈی	۱۹۸۶ء	ناگپور یونیورسٹی

ملازمت:

۱۔ اسلامیہ ہائی اسکول، ناگپور	مدرس		یکم جولائی ۱۹۶۹ء تا ۵ مئی ۱۹۷۳ء
۲۔ ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور	لکچرر اردو/ فارسی		۲۱ نومبر ۱۹۸۱ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء
۳۔ پوروال کالج، کامٹی (ناگپور)	لکچرر اردو		۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۹۰ء

تصانیف:

۱۔ ملت اسلامیہ کا سفر	۱۹۸۰ء	تحقیق
۲۔ بیان میرٹھی حیات وشاعری	۱۹۸۰ء	تحقیق وتنقید
۳۔ کامٹی کی ادبی تاریخ	۱۹۸۲ء	تحقیق وتنقید
۴۔ دستِ کوہکن	۱۹۸۳ء	شعری مجموعہ
۵۔ تاریخ ناگپور	۱۹۸۳ء	تحقیق وتاریخ
۶۔ شرارِ جستہ	۱۹۸۵ء	شعری مجموعہ
۷۔ شرح قصیدہ مدیح خیر المرسلین	۱۹۸۹ء	شرح وتنقید
۸۔ رعنائیِ خیال	۱۹۸۹ء	شرح وتنقید
۹۔ واردات ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	تحقیق وتنقید
۱۰۔ حرا کی روشنی	۱۹۹۰ء	نعتیہ شاعری کا مجموعہ
۱۱۔ سرسید اوران کے مضامین ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	تحقیق وتنقید
۱۲۔ شرح کلام غالب (ردیف واؤ)	۱۹۹۰ء	شرح
۱۳۔ شرح اشعارِ مومن	۱۹۹۲ء	شرح
۱۴۔ ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر	۱۹۹۳ء	تحقیق وتنقید
۱۵۔ معیارِ ادب	۱۹۹۴ء	تنقیدی مضامین کا مجموعہ
۱۶۔ ناگپور کا مسلم معاشرہ (جلد اول)	۱۹۹۶ء	تحقیق وتاریخ

۱۷۔ قطرہ قطرہ	۱۹۹۶ء	تنقید و صحافت
۱۸۔ آئینہ سیما	۱۹۹۶ء	شعری مجموعہ
۱۹۔ ناگپور کا مسلم معاشرہ (جلد دوم)	۱۹۹۷ء	تحقیق و تاریخ
۲۰۔ بیان میرٹھی اور غالب	۱۹۹۷ء	تحقیق
۲۱۔ تازگی	۱۹۹۹ء	بچوں کے لئے نظمیں
۲۲۔ تسبیح و زنار	۱۹۹۹ء	قومی یکجہتی پر مضامین
۲۳۔ بیان میرٹھی کی جدید نظمیں	۲۰۰۰ء	تحقیق
۲۴۔ ناگپور کا مسلم معاشرہ (جلد سوم)	۲۰۰۰ء	تحقیق و تاریخ
۲۵۔ برار کی تمدنی و علمی تاریخ	۲۰۰۱ء	تحقیق و تاریخ
۲۶۔ ناگپور میں فارسی	۲۰۰۲ء	تحقیق
۲۷۔ خاقانی شروانی: حیات و شاعری	۲۰۰۲ء	تحقیق و تنقید
۲۸۔ مقدس نعتیں	۲۰۰۳ء	نعتیہ شاعری کا مجموعہ
۲۹۔ کلیاتِ عادل ناگپوری	۲۰۰۶ء	تحقیق و تدوین
۳۰۔ دیوانِ بیان میرٹھی	۲۰۰۷ء	تحقیق و تدوین

انعامات:

۱۔ بیان میرٹھی حیات و شاعری پر ۱۹۸۱ء میں یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ سے انعام ملا۔

۲۔ بیان میرٹھی حیات و شاعری پر ۱۹۸۱ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی، بمبئی سے انعام ملا۔

۳۔ کامٹی کی ادبی تاریخ پر ۱۹۸۳ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی، بمبئی سے انعام ملا۔

۴۔ تاریخ ناگپور پر ۱۹۸۴ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی، بمبئی سے انعام ملا۔

۵۔ ناگپور میں اردو کا ارتقائی کا سفر پر ۱۹۹۴ء میں یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ سے انعام ملا۔

۶۔ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۹۷ء میں امتیاز میر ایوارڈ ملا۔

۷۔ بیان میرٹھی اور غالب پر ۱۹۹۸ء میں یوپی اردو اکادیمی، لکھنؤ سے انعام ملا۔
۸۔ مجموعی علمی وادبی خدمات پر مہاراشٹر اردو اکادیمی، بمبئی سے ۱۹۹۸ء میں ریاستی ایوارڈ (سراج اورنگ آبادی ایوارڈ) ملا۔
۹۔ مجموعی علمی وادبی خدمات پر سرسید اکادیمی، ناگپور سے ۱۹۹۸ء میں سرسید ایوارڈ ملا۔
۱۰۔ عطار اربن کوآپریٹیو سوسائٹی، ناگپور سے ناگپور کا مسلم معاشرہ پر ۲۰۰۰ء میں انعام ملا۔
۱۱۔ مجموعی علمی و ادبی خدمات پر یونائیٹیڈ اسٹوڈینٹس اسوسی ایشن، ناگپور سے ۲۰۰۲ء میں مولانا آزاد ایوارڈ ملا۔
۱۲۔ انڈین کوائن سوسائٹی، ناگپور سے ۲۰۰۲ء میں ناگپور ہیری ٹیج ایوارڈ ملا۔
۱۳۔ ناگپور میں فارسی پر ۲۰۰۳ء میں مہاراشٹر اردو اکادیمی، بمبئی سے انعام ملا۔
۱۴۔ انڈین کوائن سوسائٹی ناگپور سے تاریخ ناگپور کے سلسلے میں ۲۰۰۴ء میں سرٹیفکٹ آف آنر ملا۔

اعزازات:

۱۔ ٹرسٹی جامع مسجد ٹرسٹ، مومن پورہ، ناگپور (۴ دسمبر ۱۹۹۴ء سے ۵ ستمبر ۲۰۰۴ء تک)
۲۔ صدر مسلم قبرستان، بھانکھیڑا، مومن پورہ، ناگپور (۱۷ اکتوبر ۱۹۹۶ء سے)
۳۔ رکن مجلسِ شوریٰ، دارالعلوم، مومن پورہ، ناگپور (۲۲ ستمبر ۱۹۹۶ء سے)
۴۔ سکریٹری دارالعلوم، مومن پورہ، ناگپور (یکم نومبر ۱۹۹۶ء سے ۶ جولائی ۲۰۰۳ء تک)
۵۔ صدر دارالعلوم، مومن پورہ، ناگپور (۶ جولائی ۲۰۰۳ء سے ۲ جولائی ۲۰۰۶ء تک)
۶۔ مہمان رکن اردو لسانی کمیٹی بال بھارتی، پونے (۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۵ء تک)
۷۔ رکن مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادیمی (۲۳ نومبر ۲۰۰۰ء سے ستمبر ۲۰۰۲ء تک)
۸۔ چیئرمن اکیڈمک کونسل ملت ہائی اسکول، ناگپور (۲۸ ستمبر ۲۰۰۴ء سے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سچائی کا اعتراف

ناگپور کی ادبی، علمی وثقافتی تاریخ کی ترتیب وتالیف کے شوق میں جب میں نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا تو مجھ کو ماہنامہ جلوۂ یار میرٹھ کے مختلف شماروں میں بیان میرٹھی (۱۸۵۰ء۔۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء) کا کلام نظر آیا۔ یہ اتنا مؤثر اور جامع تھا کہ میں اس شاعر کی تلاش میں بھی مصروف ہوگیا اور کوششوں کے بعد کافی مواد حاصل کیا۔

بیان میرٹھی پر میری پہلی کتاب: بیان میرٹھی، حیات وشاعری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ ادبی دنیا میں مقبول ہوئی۔ اس کو مہاراشٹر اور اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ دوسری کتاب بیان میرٹھی اور غالب ۱۹۹۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اسے بھی ادبی حلقے میں پسند کیا گیا۔ اس کو بھی اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے سرفراز کیا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی نے اس کی پچاس جلدیں خرید کر تقسیم کیں۔ تیسری کتاب بیان میرٹھی کی جدید نظمیں ۲۰۰۰ء میں چھپی۔ اسے بھی قبولیت کی سند ملی۔ یہ کتاب بیان کی نیچرل، قومی، اخلاقی، عشقیہ، رثائیہ اور مدحیہ نظموں کے علاوہ نوچندی میرٹھ کے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔

اب میں بیان میرٹھی کا دیوان شائع کر رہا ہوں۔ اس میں بیان کی غزلیں، قصائد، مثنویات، تضمینات، رباعیات، قطعات، نوحے اور سہرے وغیرہ ہیں۔ بیان کی جدید نظموں کی طرح انھیں بھی میں نے ماہنامہ لسان الملک میرٹھ، ماہنامہ جلوۂ یار میرٹھ اور بیان میرٹھی کے شاگرد خان بہادر شیخ بشیر الدین تسخیر میرٹھی کے صاحبزادے بھیا غیاث الدین مرحوم کے کتب خانے میں موجود بیان

کے غیر مطبوعہ کلام کی روشنی میں ترتیب دیا ہے۔ جس کلام کے نیچے حوالہ نہیں ہے وہ قلمی مسودے سے لیا گیا ہے۔

بیان کی نعتیہ شاعری کے دو مجموعے مختلف اوقات میں عطر مجموعہ نعت (۱۸۸۵ء) اور قندیلِ حرم (۱۹۷۴ء) کے نام سے شائع ہوئے۔ اول الذکر کے مرتب بیان اور ثانی الذکر کے مرتب ڈاکٹر سید صفدر حسین ہیں۔ لیکن ان دونوں مجموعوں میں صرف نام کا فرق ہے۔ اسی طرح بیان کے سلام اور مرثیے کا مجموعہ: رنگِ شہادت بیان کے ایک شاگرد سید محمود علی گرامی نے مرتب کر کے ۱۹۱۹ء میں چھپوایا تھا۔ اسی کو ڈاکٹر سید صفدر حسین نے ۱۹۷۴ء میں از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کروایا اس لیے میں نے ان دونوں مجموعوں کا کوئی کلام دیوان میں شامل نہیں کیا ہے۔ یہ دونوں مجموعے میرے پاس موجود ہیں۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بیان کی غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ بھی نقشِ بیان کے نام سے شائع کروایا ہے۔ اس میں ان کی ایک مثنوی حواسِ خمسہ بھی ہے۔ لیکن کافی کوششوں کے باوجود نقشِ بیان کا نسخہ مجھ کو نہ مل سکا۔ اس کا مجھ کو بے حد افسوس ہے۔

میں نے اپنی کوششوں سے بیان کا جو دیوان مرتب کیا تھا۔ وہ برسوں سے اشاعت کا منتظر رہا۔ اب جبکہ میں ضعفِ بینائی کا بری طرح شکار ہوں۔ خیال آیا کہ کیوں نہ اسے شائع کر کے منظرِ عام پر لے آؤں تاکہ یہ محفوظ ہو جائے اور اہلِ ادب بھی اس سے استفادہ کر سکیں لہٰذا اسے چھپوا رہا ہوں۔ اس میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔ ممکن ہے اس میں بے شمار غلطیاں بھی ہوں لیکن اب میں مزید تلاش و تحقیق کرنے سے مجبور ہوں۔ برادرم ڈاکٹر مدحت الاختر کا بے انتہا ممنون ہوں۔ انھوں نے پروف ریڈنگ کی ذمے داری قبول کی۔ نورِ چشم محمد رفیع الدین اور عزیزم ثاقب انجم کا بھی مشکور ہوں۔ ان دونوں نے اس کی کمپوزنگ اور تزئین و اشاعت میں میری مدد فرمائی۔

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس تعاون کے لیے میں کونسل کے تمام عہدیداران و اراکین کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ناچیز

شرف الدین ساحل

ناگپور

۲ اگست ۲۰۰۷ء

بیان میرٹھی

بیان میرٹھی انیسویں صدی کے ایک استاد شاعر، بہترین صحافی اور اچھے انشا پرداز تھے۔ میں ان کی زندگی وشاعری پر گزشتہ ۳۶ سال سے تحقیق کر رہا ہوں۔ میری کتاب: بیان میرٹھی حیات و شاعری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دو اور کتابیں: بیان میرٹھی اور غالب ۱۹۹۷ء اور بیان میرٹھی کی جدید نظمیں (۲۰۰۰ء) منظر عام پر آئیں۔ اب ان کا دیوان شائع کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں مجھ کو بیان کی زندگی کے متعلق جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کو بیان کے ان حالات میں شامل کر کے زیرِ نظر مضمون تیار کیا گیا ہے جو میری کتاب بیان میرٹھی حیات وشاعری میں باب اول کے تحت ہے۔ اس اضافے سے بیان کی زندگی اور ان کی شخصیت کے کئی نئے گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔

خاندان:

بیان کے آباواجداد، سادات کی قدیم بستی جار چہ، ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کو شہنشاہ غیاث الدین بلبن (وفات: ۱۲۸۷ء) نے بیان کے مورث اعلا سید محمود کو جاگیر کے طور پر عطا کیا تھا۔ (۱)

بیان کے والد کا نام سید گوہر علی تھا، جو لوگوں میں میر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام سید کرامت علی تھا۔ بیان نے اپنے والد کے نام کا سجع کہا تھا: (۲)

بحرِ کرامت کا گوہر علی

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے زمانے میں سید گوہر علی کے خاندان پر سات انگریزوں کے قتل کا الزام تھا۔ چنانچہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا مکان محلہ کرم علی میں شاہ بھن کی مسجد کے قریب تھا۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے مذکورہ واقعہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:(۳)

> ''بلند شہر کے ضلع میں جارچہ نام کا ایک قصبہ خاصا مردم خیز خطہ تھا جہاں رضوی سادات متمول اور ذی اقتدار تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران، وہاں کے سادات پر سات انگریزوں کے قتل کرنے کا الزام تھا۔ اس لیے ان کی املاک بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھیں۔ اس ضبط شدہ جائیداد کا کچھ حصہ، باغپت، ضلع میرٹھ کے ایک رئیس راؤ خورشید علی خان نے اور باقی حصہ دلی کے ایک جوہری سلطان سنگھ نے خرید لیا تھا۔ تبدیلِ ملکیت کے نتیجے میں وہاں کے سادات کے پاس سوائے کاشتکاری کے کوئی اور وسیلہ معاش کا نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے عزتِ نفس کے خیال سے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر قرب وجوار کے شہروں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہجرت کرنے والے ان خانوادوں میں ایک گھرانا سید گوہر علی رضوی کا بھی تھا، جس کے افراد میرٹھ شہر میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔''

سید گوہر علی کا موضع الدن، ضلع میرٹھ کے رئیس سید عمر دراز علی (ڈپٹی کلکٹر) کی صاحبزادی جہاں بانو سے عقد ہوا تھا جن کا تعلق شرفا اور علمی وادبی خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں کئی اصحاب رئیس اور وابستۂ سرکار تھے۔ سید عمر دراز علی آگرہ، کالپی اور جھانسی میں اعلا منصب پر فائز رہے۔ انھوں نے ۱۸۶۰ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے بیٹے سید مہدی علی بھی اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بسلسلۂ ملازمت یوپی کے مختلف شہروں میں سکونت پذیر رہے۔ ڈپٹی کلکٹر کے مرتبے تک پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کا ۱۹۰۵ء میں گورکھپور میں انتقال ہوا۔ ان کی تصنیف شہاب ثاقب سے

ان کے علمی مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔(۴)

سید عمر دراز علی کے بھائی سید کفایت علی ایک اچھے شاعر تھے۔وہ تنہا اور راشد تخلص کرتے تھے۔محکمہ انسداد ٹھگی وڈکیتی کے محافظ دفتر و میر منشی رہے۔بعد کو پنجاب کے ضلع کے سر رشتہ دار اور پھر پنجاب ودہلی میں میر منشی و سپرنٹنڈنٹ کمشنری رہے۔انھوں نے ۳۳ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۶۸ء میں پنشن پائی۔یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی اور میرٹھ میں دفن ہوئے۔ان کا دیوانِ اردو،کلیاتِ فرقانی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔(۵)

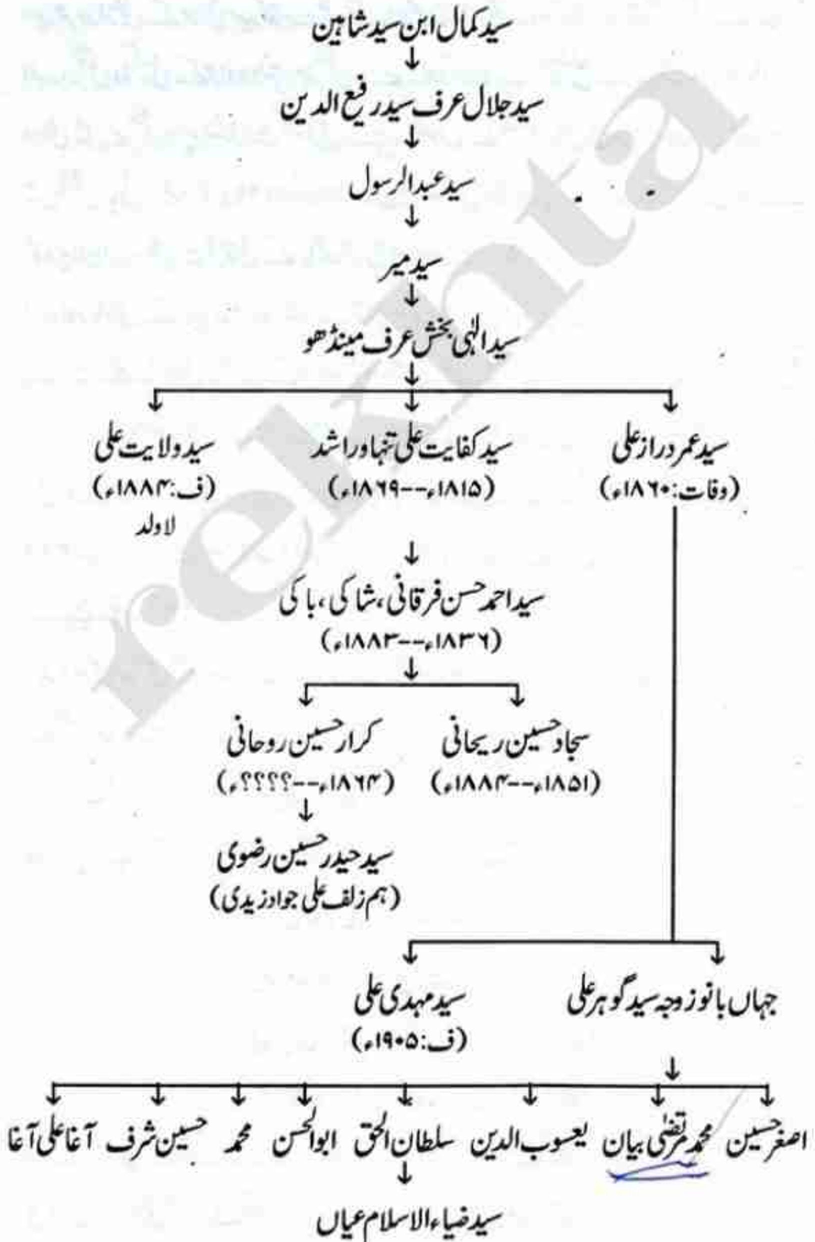
اردو اور فارسی کے جید عالم اور بلند پایہ شاعر سید احمد حسن فرقانی میرٹھی (پیدائش:۱۸۳۶ء) انھی کے بیٹے تھے۔فرقانی غالب کے ہمعصر و ہم مجلس تھے۔غالب اور فرقانی میں خط وکتابت بھی تھی۔غالب کے دو خطوط ان کے نام ملتے ہیں۔انھوں نے ۴۷ سال کی عمر میں ۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء کو وفات پائی اور میرٹھ میں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔منشی سجاد حسین ریحانی (پیدائش ۱۲۶۸ھ......وفات:۱۳۰۰ھ) اور منشی کرار حسین روحانی (پیدائش:۱۲۸۱ھ) دونوں فرقانی ہی کے بیٹے تھے۔(۶)

سید گوہر علی خاصی علمی صلاحیت کے مالک تھے اور علوم متداولہ پر عبور رکھتے تھے۔انھیں شاعری سے بھی حد درجہ مزاولت تھی۔حضرت فرقانی کو ان سے بڑی محبت تھی۔ایک مرتبہ جب وہ میرٹھ سے اپنے آبائی وطن جارچہ تشریف لے گئے تو فرقانی نے انھیں ایک خط لکھا تھا،جس میں ان کی جدائی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔اسی خط میں ان کے متعلق یہ قطعہ بھی تھا:

ازاں روز یکہ در بخشد صدف را ابر نیسانی
نیامد در کفِ بحرِ سیادت چوں تو یک گوہر
چہ پرسی ماجرائے من کہ از رنجِ فراقِ تو
دلم چولولو سوراخ است چوں رشتہ تنم لاغر

انشائے فرقانی کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوہر علی نے کچھ شعر اور تضمین فرقانی کو اصلاح کی غرض سے بھیجی تھی،جسے انھوں نے درست کر کے واپس کر دیا تھا۔(۷)

فرقانی کے خاندن کا شجرہ:(۸)



سید گوہر علی کا انتقال ۸ مارچ ۱۸۹۳ء کو میرٹھ میں ہوا۔ والد کی موت سے متاثر ہو کر بیان نے یہ اشعار کہے ہیں:(۹)

گوہر شہوار سے برجِ جہاں خالی ہوا — نیرِ اوجِ شرف سے آسماں خالی ہوا
عالمِ خاکی نظر آتا ہے ویرانے کی طرح — کیا کہوں کیسے مکیں سے یہ مکاں خالی ہوا
کیوں نہ ہو تاریک عالم، دیدۂ مشتاق میں — نورِ شمعِ دودماں سے دودماں خالی ہوا
رحلتِ سالارِ لشکر سے ہوا لشکر تباہ — رہنمائے کارواں سے کارواں خالی ہوا
گلشنِ جنت ہوا، معمورِ زینت ہمصفیر — اس گلِ دستار سے ہر بوستاں خالی ہوا

اس کے چھپتے ہی مہِ شعباں ہوا ماہِ عزا
مومنیں کو عید کا چاند اے بیاں خالی ہوا

سید گوہر علی کے آٹھ بیٹے تھے:(۱) سید اصغر حسین،(۲) سید محمد مرتضٰی بیان یزدانی،(۳) سید یعسوب الدین (۴) سید سلطان الحق،(۵) سید ابوالحسن،(۶) سید محمد، (۷) سید حسین شرف (۸) سید آغا علی آغا۔

ان میں سید محمد کا انتقال عین جوانی میں والد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ بیان یزدانی، سید ابوالحسن اور سید آغا علی آغا کو چھوڑ کر باقی تمام بھائی معزز عہدوں تک پہنچے۔ سید اصغر حسین عدالت میرٹھ میں ہیڈ کلرک رہے۔ سید یعسوب الدین ضلع جالون میں امین کورٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سید سلطان الحق دفتر کلکٹری گورکھپور میں سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ اپنے ماموں سید مہدی علی کے داماد تھے۔ سید حسین شرف علی گڑھ میں نائب تحصیلدار تھے۔(۱۰)

غرض بیان کا خاندان علمی اور ادبی لحاظ سے مالا مال تھا۔ نانا اور والد پڑھے لکھے تھے۔ عربی اور فارسی پر انھیں پوری طرح دسترس حاصل تھی۔ ماموں تعلیم یافتہ اور صاحب فضل وکمال تھے۔ تمام بھائی پڑھے لکھے تھے۔ سید آغا علی آغا اور سید حسین شرف کو بھی شاعری کا شوق تھا۔ لسان الملک میں ان کا کچھ کلام شائع ہوا ہے۔ سید محمد عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ بیان کی کتاب ''عطر مجموعۂ نعت'' پر عربی زبان میں ان کی لکھی ہوئی تقریظ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ سید ضیاالاسلام عیاں میرٹھی (پیدائش:

۱۸۹۷ء، وفات: ۲۱ جنوری ۱۹۳۵ء) اس خاندان کے آخری نامور شاعر گزرے ہیں۔ یہ سلطان الحق (ف: ۱۹۰۷ء) کے بیٹے اور بیان کے سگے بھتیجے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام ۱۹۵۶ء میں "کلامِ عیاں" کے نام سے سول اینڈ ملٹری پریس، راولپنڈی (پاکستان) سے شائع ہو چکا ہے۔

اس خاندان کی ایک نام لیوا رابعہ خاتون نہاں میرٹھی کا بھی پتا چلتا ہے جو راولپنڈی (پاکستان) میں مقیم تھیں۔ یہ صفی صاحب کی بیٹی ہیں۔ صفی رشتے میں بیان یزدانی کے یک جدی بھائی تھے۔ یعنی وہ کرامت علی (بیان کے دادا) کے چچا کے خاندان سے تھے۔ اسی لیے بعض تذکروں میں نہاں کو بیان کی بھتیجی کہا گیا ہے۔ (۱۱) بیان کے خاندان کے لوگ ۱۹۴۷ء تک میرٹھ ہی میں آباد تھے۔ آزادی کے بعد یہ لوگ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ولادت:

بیان کا پورا نام سید محمد مرتضیٰ تھا۔ اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ مذہباً اثنا عشری شیعی تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام رضاؑ سے ملتا ہے۔ (۱۲) ان کی پیدائش ان کے نانا سید عمر دراز علی کے مکان پر ہوئی تھی، جو اس وقت جھانسی (بندیل کھنڈ) میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے میرٹھ میں نشو و نما پائی اور زندگی کا بڑا حصہ بھی اسی شہر میں گزارا، اس لیے میرٹھی کہلائے۔ (۱۳)

باوجود تحقیق بسیار بیان کی صحیح تاریخِ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ بعض کتب و رسائل میں صرف سنِ ولادت کے اشارے ملتے ہیں۔ ان میں بھی کافی اختلافات ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر جو ماخذ ہیں، ان کی تفصیل دیکھیے:

۱۔	خم خانۂ جاوید (جلد اول)	۱۸۴۰ء
	قاموس المشاہیر	۱۸۴۰ء
۲۔	مراۃ الشعرا (جلد دوم)	۱۸۴۶ء
۳۔	ماہنامہ آج کل، نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء	۱۸۵۰ء

	ماہنامہ آج کل، نئی دہلی اگست ۱۹۹۲ء	۱۸۵۰ء
	رنگ شہادت مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین	۱۸۵۰ء
	قندیل حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین	۱۸۵۰ء
۴۔	ماہنامہ العصر لکھنو، اگست، ستمبر ۱۹۱۳ء	۱۸۵۶ء
	روزنامہ امروز، کراچی، ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء	۱۸۵۶ء
۵۔	ماہنامہ مخزن، لاہور، مارچ ۱۹۰۴ء	۱۸۶۰ء

اول، دوم اور پنجم سنِ ولادت قیاس پر مبنی ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) ساٹھ سال کے قریب عمر پا کر ۱۹۰۰ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ (خم خانہ جاوید)

(۲) مارچ ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا اور ۵۴ برس کی عمر ہوئی۔ اس لحاظ سے تاریخ ولادت ۱۸۴۶ء ہوتی ہے۔ (مراۃ الشعرا)

(۳) تقریباً چالیس سال کے سن میں ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء کو اردو زبان کی شاعری کی صدر نشینی چھوڑ کر ہمیشہ کی تنہائی اختیار کی۔ (ماہنامہ مخزن)

یہ قیاسات مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں غلط ثابت ہوتے ہیں:

(۱) سب اس بات پر متفق ہیں کہ بیان کی پیدائش ان کے نانا سید عمر دراز علی کے مکان پر ہوئی جو اس وقت جھانسی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ علی جواد زیدی نے فرقانی میرٹھی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ عمر دراز علی اور ان کے بھائی کفایت علی غالباً ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء کے مابین بسلسلۂ ملازمت آگرہ میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں عمر دراز علی ٹرانسفر ہو کر آگرہ سے جھانسی آئے اور کفایت علی فیروز پور (پنجاب) گئے۔ (۱۴)

(۲) اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ سید عمر دراز علی نے ۱۸۶۰ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد بیان اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ جھانسی سے میرٹھ آئے۔ (۱۵)

ان حقائق کی روشنی میں بیان کا سالِ ولادت ۱۸۴۰ء، ۱۸۴۶ء اور ۱۸۶۰ء غلط ہوکر رہ جاتا ہے۔ماہنامہ العصر،لکھنو کے مقالہ نگار پیارے لال شاکر میرٹھی اور روز نامہ امروز،کراچی کے مقالہ نگار خدابندہ نے جوسنِ پیدائش بتایا ہے۔اس کی تردید خود انھیں کے بتائے ہوئے ایک واقعے سے ہوتی ہے۔دیکھیے:

> (۱) بیان بہت خوبصورت تھے اور رنگ گورا چٹا تھا۔اس کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔غدر کے زمانے میں جب کہ امن وامان کا جنازہ ملک سے اٹھ چکا تھا سید بیان کو بعالمِ طفلی کہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا پڑا۔اتفاق سے راستے میں باغیوں کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ان نامرادوں نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھ کر گرفتار کرلیا اور ڈیڑھ سوروپے لے کر چھوڑا۔(ماہنامہ العصر)
>
> (۲) بیان بہت گورے چٹے تھے۔ایک مرتبہ تیلنگون نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھ کر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں پکڑلیا اور ڈیڑھ سوروپے لے کے چھوڑا۔(روزنامہ امروز)

اگر یہ واقعہ درست ہے تو مقالہ نگاروں کے بتائے ہوئے سن کے مطابق بیان کی عمر اس وقت ایک سال کی رہی ہوگی اور اس عمر میں تیلنگون کا انھیں پکڑلینا محال ہے۔اس واقعے سے مخزن کے مضمون نگار کا قیاس بھی غلط ہوکر رہ جاتا ہے۔واقعہ مذکورہ کے اعتبار سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آج کل، رنگ شہادت اور قندیلِ حرم کے مضمون کے مطابق بیان کی عمر ۷ سال کی ہوتی ہے اور اس عمر میں تیلنگون کا انھیں پکڑلینا قرینِ قیاس ہے۔لہٰذا یہ ممکن ہے کہ بیان ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے ہوں۔

تعلیم وتربیت:

بیان کے سوانح نگاروں نے عام طور سے یہ بات لکھی ہے کہ ان کا بچپن جھانسی اور کالپی میں نانا کے ہمراہ گزرا تھا۔وہ نانا کے انتقال (۱۸۶۰ء) کے بعد اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ

میرٹھ آئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور اپنی خداداد ذہانت کی بدولت بہت جلد درسی نصاب ختم کرلیا۔ بعد کو میرٹھ کے ایک شیعی عالم مرزا باقر علی بیگ سے عربی اور فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ پھر خود ہی کئی زبانوں اور علوم وفنون کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور بہت جلد اپنی علمی استعداد کو مستحکم اور وسیع بنالیا۔ اس کے ثبوت کے لیے چند اقتباسات دیکھئے:

(۱) (بیان ۱۸۵۶ء میں جھانسی میں پیدا ہوئے) چار سال کی عمر میں شفیق نانا کا سایہ اٹھ گیا لیکن دور اندیش باپ نے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر اسے کماحقہ، انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ سید گوہر علی ایک قابل بزرگ تھے اور جیسا کہ قدیم زمانے میں شریف خاندانوں کا عام دستور تھا وہ پڑھے لکھے تھے اور علومِ مشرق میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ سید بیان کی ابتدائی تعلیم انھوں نے خود کی اور جب تعلقاتِ ملازمت کی وجہ سے وہ اس کام سے معذور ہوئے تو مرزا باقر علی بیگ نے جو میرٹھ میں فرقہ شیعہ کے پیش نماز تھے، سید بیان کی تعلیم کی تکمیل کرائی۔ (ماہنامہ العصر لکھنو، اگست، ستمبر ۱۹۱۳ء)

(۲) ان کے والد گوہر علی بڑے لائق شخص تھے اس لیے بعض ابتدائی درسی کتابیں انھیں سے پڑھیں۔ پھر کچھ روز میرٹھ کے ایک شیعہ عالم مرزا باقر علی بیگ سے درس لیا۔ (روزنامہ امروز کراچی، ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص: ۷)

(۳) بیان ۱۸۶۰ء تک جب کہ ان کے نانا کا انتقال ہوا جھانسی اور کالپی وغیرہ میں مقیم رہے اور تقریباً دس سال کی عمر میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ میرٹھ آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد میرٹھ کے مشہور عالم دین مولانا باقر علی بیگ سے مروجہ درسی کتب پڑھی تھیں۔ (قندیل حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین)

اسی بات کو الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی بیان کے تذکرے میں دہرایا ہے لیکن امان اللہ خان شیروانی کے مضمون: بیان یزدانی میں ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں یہ مفید اضافے ملتے ہیں: (۱۶)

> بیان یزدانی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ ان کے خاندان میں بھی بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ عربی کی تعلیم انھوں نے شمس العلما قاری عباس حسین اور مولوی جعفر علی قاری سے حاصل کی۔ بیان نے اپنی قابلیت زیادہ تر ذاتی مطالعہ سے بڑھائی۔

میرے نزدیک یہ ادھوری سچائیاں ہیں۔ میری تازہ تحقیق کے مطابق بیان اپنے نانا سید عمر دراز علی کے انتقال (۱۸۶۰ء) کے بعد دیگر افراد خاندان کے ساتھ میرٹھ آئے۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ۱۸۶۲ء میں سید کفایت علی تنہا (والد سید احمد حسن فرقانی) پنجاب سے منتقل ہو کر دہلی آئے جہاں وہ ۱۸۶۸ء تک کمشنر دہلی کے میر منشی رہے۔ انشائے فرقانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سید کفایت علی نے سید عمر دراز علی کے اہل و عیال کو بھی اپنے پاس دہلی بلوالیا تھا اور وہ انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ علی جواد زیدی کے مضمون: سید احمد حسن فرقانی میرٹھی میں جگہ جگہ سید مہدی علی ابن سید عمر دراز علی کی دہلی میں ان کے ساتھ رہنے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۸ء تک بیان کا ننہال دہلی میں تھا۔ میرا خیال ہے کہ جب سید کفایت علی نے اپنے بھائی سید عمر دراز علی کے اہل و عیال کو دہلی بلوایا تو ان کے ساتھ بیان بھی دہلی آئے اس لیے کہ وہ انھی کے ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ان کی مزید تعلیم و تربیت سید کفایت علی، سید احمد حسن فرقانی اور سید مہدی علی کی نگرانی میں دہلی میں ہوئی۔ یہ بات میں اس بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ بیان نے میرٹھ کے ایک شیعی عالم مرزا باقر علی بیگ سے تعلیم پائی تھی۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن سے فرقانی کے گہرے مراسم تھے اور وہ دہلی کے رہنے والے تھے انھوں نے بعد کو میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ علی جواد زیدی، فرقانی کے دہلی کے احباب کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں: (۱۷)

''دلی میں کوئی مولوی مرزا باقر علی بیگ بھی تھے۔ ان سے بھی (فرقانی کے)
مراسم تھے۔ غالباً انھوں نے بعد میں میرٹھ میں ہی قیام اختیار کر لیا تھا۔''

اس ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے بعد بیان نے عربی و فارسی کی اعلا تعلیم شمس العلما قاری عباس حسین اور مولوی قاری سید جعفر علی سے حاصل کی تھی جیسا کہ امان اللہ خاں شروانی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان سے بھی فرقانی کے گہرے تعلقات تھے۔ کافی تلاش کے بعد بھی قاری عباس حسین کے بارے میں معلومات فراہم نہ ہو سکی۔ البتہ مولوی قاری سید جعفر علی کے انتقال (۱۸۹۶ء) سے متاثر ہو کر بیان نے جو پُر درد طویل مرثیہ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنے وقت کے جید عالم اور نیک صفت انسان تھے۔ اس مرثیے کے دو بند کے چند اشعار دیکھیے: (۱۸)

شمسِ مبیں حضرتِ جعفر علی — شمعِ یقیں حضرتِ جعفر علی
قبلۂ دیں، کعبۂ اسلام کے — رکنِ رکیں حضرتِ جعفر علی
انجمنِ علمِ شریعت میں تھے — صدر نشیں حضرتِ جعفر علی
مشرق و مغرب میں اندھیرا ہوا — آج نہیں حضرتِ جعفر علی

نائبِ مہدی نہ رہا خاک پر
خاک پڑی گردشِ افلاک پر

قرأت و تجوید کے قلزم تھے آپ — دہر میں سیارۂ ہشتم تھے آپ
علمِ الٰہی کے سمٰوات پر — نیرِ اعظم شہہِ انجم تھے آپ
بحرِ محیطِ دو جہاں علم تھا — منبعِ تعلیم و تعلم تھے آپ
ناشرِ آیاتِ الٰہی تھے لب — رافعِ رایاتِ شہہِ قم تھے آپ

تیرہ جہاں ہے وہ گئے ہات سے
کوچ کیا خضر نے ظلمات سے

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیان نے دہلی میں اپنے وقت کے جید علما سے اکتساب

فیض کیا تھا۔ان کے اردو اور فارسی کلام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھیں مختلف فنون میں کامل دستگاہ تھی۔فارسی اور عربی، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، تصوف، ہیت اور نجوم سب کا علم ماہرانہ تھا۔

شاعری کی ابتدا:

بیان نے جس خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ خالص ادبی، علمی اور شعری تھا۔اسی فضا میں ان کی ذہنی نشو ونما ہوئی جس کے باعث ان کو شاعری کا شوق ابتدائے سنِ شعور ہی میں ہوگیا تھا۔مزاج بھی شاعرانہ تھا، لہٰذا ابتدائی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے بغیر شعر کہنا شروع کیا۔دہلی میں سید احمد حسن فرقانی میرٹھی کے ساتھ رہتے تھے اس لیے ان کی ادبی محفلوں کو دیکھنے اور ان میں شریک ہونے کا موقع ملا۔اسی ماحول نے ان کے ذوقِ شعری کو بے انتہا تقویت پہنچائی۔بیان صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن تھے اور فہیم وذکی بھی، بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کرلی اور اپنے ذاتی جوہر، علمی قابلیت اور مشقِ سخن سے خود کمال حاصل کرلیا۔امان اللہ خان شیروانی اپنے مضمون میں صغیر اصغر کے مضمون: غالب اور جعفر علی (مطبوعہ ماہنامہ ماہ نو کراچی، مطابق ۱۹۶۵ء) کے حوالے سے بیان کی شاعری کے ابتدائی دور کے متعلق یہ واقعہ بھی لکھتے ہیں: (۱۹)

> "بیان کسی کے شاگرد نہیں تھے۔وہ تو فطری شاعر تھے۔وہ بہت جلد مشہور ہوگئے اور صرف ۱۴ سال کی عمر میں ہی انھوں نے اردو زبان اور اردو شاعری میں اتنا عبور حاصل کرلیا تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ایک روز مرزا غالب کی زمین میں ایک غزل لکھی۔غالب کا مطلع ہے:
>
> غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
> بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
>
> بیان کی غزل کے چند اشعار یوں ہیں:
>
> صبح قیامت آئیگی کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
> آئے وہ در سے ناگہاں کھوئے ہوئے قبا کہ یوں

نرگسِ مہوشاں سے پوچھ، گردشِ آسماں سے پوچھ
سرمہ ہوئے وفا سرشت کیا کہوں اے خدا کہ یوں

ریختہ رشکِ فارسی اس سے نہ ہوسکا بیاں
محفلِ عرسِ میر میں شعر مرے سنا کہ یوں

یہ غزل وہ مرزا غالب کی خدمت میں لے گئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ غالب نے غزل پڑھ کر واپس کردی اور فرمایا: ''میاں میں کیا اصلاح دوں جیسا میں نے کہا ویسا ہی تم نے کہہ دیا۔''

جس زمانے میں بیان دہلی میں تھے ان کی حیثیت فرقانی کے خاندان کے ایک فرد کی تھی۔ انھوں نے انھی ایام میں یقیناً غالب کو دیکھا ہوگا جن کی آمدورفت فرقانی کے گھر تھی۔ بیان نے غالب کی خدمت میں کسی موقع پر یقیناً وہ غزل پیش کی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

جب ۱۸۶۸ء میں سید کفایت علی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو یہ خاندان میرٹھ میں مستقل آباد ہوگیا۔ ان کے ساتھ بیان بھی میرٹھ آئے اور اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس وقت میرٹھ کی فضا شعروادب کی کیفیتوں سے معمور تھی۔ جگہ جگہ شعروشاعری کے تذکرے تھے اور مشاعرے بھی کثرت سے ہوتے تھے۔ بیان کی شاعری کی نشوونما میرٹھ کے جس ادبی اور علمی ماحول میں ہوئی تھی، اس پر ڈاکٹر سید صفدر حسین نے قندیلِ حرم کے دیباچہ میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں: (۲۰)

''گھر کے ماحول کے علاوہ شہر کی علمی اور ادبی فضائیں تھیں جن میں بیان کے ادبی مذاق کی نشوونما ہوئی۔ میرٹھ شہر سے دلی محض چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اس لیے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں دبستانِ دہلی کے عناصر بہت قوی تھے۔ علاوہ ازیں خود میرٹھ ہی کی سرزمین سے مولانا امام بخش صہبائی جیسے جید عالم پیدا ہوئے تھے جنھوں نے دلی کی علمی، ادبی اور مذہبی فضا میں اپنا نمایاں مقام پیدا کرلیا تھا۔ میرٹھ میں انھیں کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ رحیم بھی موجود تھے، جنھوں نے مرزا غالب کی علمی و ادبی

مخالفت میں ''ساطعِ برہان'' تصنیف کی تھی۔ غالب کے ایک مخلص دوست ممتاز علی خان اور دو مخصوص شاگرد یعنی محبوب علی خان نیّر اور فصیح الدین رنج اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ غالب کے علاوہ حکیم مومن خان مومن کے بعض شاگرد مثلاً نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مولا بخش قلق وغیرہ یہیں کے باشندے تھے۔ پھر بیان کے معاصرین میں مولانا شوکت میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی اور سید سجاد حسین ریحانی تھے۔ مختصر یہ کہ بیان کے ادبی شعور نے ایسے علمی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ پھر انھوں نے اپنے ذاتی ذوق، علمی مطالعے اور ادبی صحبتوں سے وہ بصیرت حاصل کر لی تھی کہ اپنے ہمعصروں میں وہ مذہب وملت، شعروادب، سیاست وحکمت اور تہذیب ومعاشرت کے ایک مبصر خیال کیے جاتے تھے۔ علمی قابلیت، ہمہ دانی، قادرالکلامی، زود گوئی، حاضر جوابی اور شوخیٔ طبع میں بھی اپنے معاصرین میں ان کا جواب نہ تھا۔''

یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے بیان کو فرقانی میرٹھی کا شاگرد لکھا ہے تو کسی نے اس کی تردید کی ہے اور انھیں تلمیذ الرحمٰن بتایا ہے گویا وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ اس سلسلے میں پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنے مضمون میں بیان کے چھوٹے بھائی سید حسین شرف کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے: (۲۱)

''برادر مرحوم حقیقت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ میر احمد حسن فرقانی ان کے ماموں تھے۔ برادر مرحوم ان کی تعظیم کرتے تھے اور اس لیے ان کو اپنا استاد بھی لکھ دیتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں انھوں نے ان کو ایک شعر بھی بنظرِ اصلاح نہیں دکھلایا بلکہ بحیثیتِ شاعرانہ ان میں اکثر مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔''

لیکن ان سب کے باوجود یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بیان کی تربیت اور ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں فرقانی کا زبردست حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ ان سے انھیں دلی عقیدت ومحبت تھی۔ اس کا ثبوت وہ طویل مرثیہ ہے جو انھوں نے فرقانی کی وفات

سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ تین بند کے یہ چند منتخب اشعار دیکھئے: (۲۲)

صیرفیِ نقدِ ہمامی تھے وہ — صیلقیِ نظمِ نظامی تھے وہ
پشتِ ظہوری و پناہِ ظہیر — شیخِ مصلّائے امامی تھے وہ
نام تھا اربابِ ہنر میں بلند — نامورِ شیوۂ نامی تھے وہ
مدِّنظر تھا قدما کا کلام — کہنہ خیالات کے حامی تھے وہ

فرقتِ فرقانی و شاکی دریغ
رحلتِ فرقانی و شاکی دریغ

نطق میں تھی قند مکرر بھری — قند مکرر سے بھی نیکو تری
مرغِ زباں تھا چمنِ نظم میں — بلبلِ بستانِ زباں آوری
زندہ ہوئی مردہ زبانِ عجم — تھی لبِ اعجاز میں جادوگری
شعر میں ہر نکتۂ باریک تھا — طرۂ طغرائے سخن پروری

فرقتِ فرقانی و شاکی دریغ
رحلتِ فرقانی و شاکی دریغ

ہیں ترے ہم چشم کہاں اے بیاں — ڈھونڈتی ہے چشمِ جہاں اے بیاں
ڈال دیا مرگ نے اردو میں غدر — لٹ گئی دلی کی زباں اے بیاں
چھوڑ گیا راکھ کی صورت مجھے — قافلۂ راہ رواں اے بیاں
کیجیے کس کس کا بیاں بس خموش — روئیے کس کس کو یہاں اے بیاں

فرقتِ فرقانی و شاکی دریغ
رحلتِ فرقانی و شاکی دریغ

جلوۂ طور کی ادارت:

میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد بیان نے جلوۂ طور کی ادارت سنبھالی۔ یہ سلسلہ تقریباً پانچ

چھ سال تک جاری رہا۔ جلوۂ طور ۱۸۶۱ء میں محلہ گنیش گنج، میرٹھ سے جاری ہوا تھا۔ جمعہ کے روز شائع ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم و مالک رائے گنیشی لال اور پرنٹر و پبلیشر شمبھو ناتھ تھے۔ اس کا سالانہ چندہ ساڑھے نو روپے تھا۔ سلطان المطابع میرٹھ میں بڑی تقطیع پر چھپتا تھا۔ جلوۂ طور کے ایڈیٹر کچھ عرصہ تک سید ظہیر الدین ظہیر بھی رہے۔ اسی طرح بعد میں اس کے مہتمم لالہ خوشی رام غالب ہو گئے تھے۔ بیان نے اپنے دور میں جلوۂ طور کے لیے جو مضامین لکھے تھے وہ بڑے بصیرت افروز ہیں۔(۲۳)

کال کوٹھری:

جلوۂ طور سے علاحدگی کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیان پر وہ مجنونانہ کیفیت طاری ہوئی جس کا وہ کم و بیش تا عمر شکار رہے۔ بعض تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ اوائل عمر میں ان کے والد انھیں شعر و سخن میں اوقات گزاری سے منع فرماتے تھے لہٰذا انھوں نے بہانا کیا کہ مجھ کو روشنی میں چکا چوند لگتی ہے اور یوں گھر کے ایک اندھیرے کمرے میں بند رہ کر اپنا شوق پورا کرنے لگے۔ بعض کا خیال ہے کہ انھوں نے جو الفاظ زبان سے نکالے تھے، آخر وہی ہو کر رہا اور وہ واقعی عارضۂ چکا چوند کا شکار ہو گئے۔ بعض اسے وہم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حکیم محمود خاں کا خیال تھا کہ یہ مرض ذہین لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔ اس مرض کے سلسلے میں بیان کے چھوٹے بھائی سید حسین شرف نے پیارے لال شاکر میرٹھی کو یہ تفصیل بتائی ہے:(۲۴)

> "حالت مرض یہ تھی کہ قریب دو سیر وزن کی کپڑے کی گٹھری بنا کر دماغ پر رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ دماغ بغیر اس کے اڑا جاتا ہے۔ تاریک کمرے میں شب و روز رہتے تھے۔ اس کے دروازوں پر پنبئی پردے پڑے رہتے کہ روشنی مطلق نہ آسکے۔ ہانڈی کے پکنے اور چھالیہ کاٹنے کی آواز بھی ناقابلِ برداشت تکلیف دیتی تھی۔ نہایت خفیف شور سے بھی وہ سخت پریشان ہو جاتے تھے۔ اگر کسی ضرورت سے باہر نکلتے تو چھتری لگا کر۔ کہتے تھے کہ تاروں کی روشنی سے اذیت پہنچتی ہے اور تارے دماغ میں

چبھتے ہیں۔ اس مرض میں وہ تمام عمر مبتلا رہے۔ البتہ چند سال بعد مرض میں وہ شدت نہ رہی تھی جو آغاز میں تھی۔ شور سے اب مطلق پریشان نہ ہوتے تھے۔ مکانِ تاریک کی نشست ترک کردی تھی۔ کپڑوں کی گٹھری سر سے کندھوں پر اتر آئی تھی۔''

ان کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ اگر وہ باہر نکلیں گے تو پریاں اٹھا کر لے جائیں گی۔ (۲۵) انھیں صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہمیشہ ایک لحاف اوڑھے رہتے اور پلنگ پر ہی نہالیا کرتے تھے۔ بیان کے خطوط میں بھی ان کی مسلسل بیماری، جسمانی ضعف اور ذہنی پریشانیوں کے اشارے ملتے ہیں۔ وہ اپنے ماموں سید مہدی علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں بھائی کی طرف ایک دری کی کوٹھی میں رہتا ہوں۔ تعدادِ مکانات سبب حسرت نہیں۔ کیوں کہ:

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا، واں رہ گیا (تیغ ہندی، ص:۵)

میر حیدر علی کو ایک خط میں اپنی کیفیت اس طرح بتاتے ہیں:

''اب آپ اپنے عجیب الخلقت دوست کا بھی حال سنیں۔ بیمار ہیں، بیکار ہیں، دنیا سے بیزار ہیں، ہمہ تن زار ہیں، بلکہ آزار ہیں، زحمتِ امراض سے ناچار ہیں، رحمتِ الٰہی کے طلب گار ہیں۔ بیٹھتے ہیں گھر کی طرح، اٹھتے ہیں چھپر کی طرح۔ چلتے ہیں جنازے کی طرح۔ خدا عفو و عافیت دے۔'' (تیغ ہندی، ص:۶۱)

مولوی ظفر احمد کو خط کا جواب نہ لکھنے کی شکایت کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جب تمہارا خط آیا تھا، میں تپ و لرزہ میں مبتلا تھا اور اس بلا کا تپ و لرزہ تھا، گویا زمین کو پہنچا آیا تھا۔ کئی دن بے ہوش رہا۔ بعض کو حیات میں تردد رہا اور مجھ کو تو اب بھی ہے۔'' (تیغ ہندی، ص:۹۴)

مولوی ظفر احمد کو ایک اور خط میں پھر خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر میں بے نصیب ہو گیا، تم تو خوش نصیب ہو۔ اگر میں ذلیل ہو گیا، تم تو ہنوز عزیز ہو۔ صاحب تمیز ہو۔ اگر مجھ میں علالت سے حالت نہیں، تمہاری حالت کہاں گئی باوجودیکہ علالت نہیں۔ اگر ہمارا حال ردّی ہے، تمہاری نیت میں کیوں بدی ہے۔ ہم بے دست و پا ہو کر چل نہیں سکتے کہ تم تک جاتے، تم ہاتھ پیر والے ایسے نکلے کہ ہم تک نہیں آتے۔'' (تیغ ہندی، ص:۱۰۳)

انھیں مولوی ظفر احمد کو کیفیت دریافت کرنے پر ایک دوسرے خط میں پھر لکھتے ہیں:

''شفا کہاں۔ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔ بیمار چلا جاتا ہوں۔ غلط کہتا ہوں۔ اب اس قدر ضعف ہے کہ چلا نہیں جاتا۔ لیکن

چلا ہی جاتا ہوں میں، گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل

پہلے پڑا تھا مگر بھلا تھا۔ اب اچھا نہیں، اچھا نہیں...... پلنگ پر پڑا، کبھی ہوش ہے، کبھی بے ہوش ہوں۔ آسمان دیکھتا ہوں اور خاموش ہوں۔'' (تیغ ہندی، ص:۹۵)

غرض کہ بیان پھر اس کوٹھری سے باہر نہیں نکلے اور عنفوانِ شباب سے آخر عمر تک وہیں گوشہ نشین رہے۔ اس کال کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے بیان شاعری اور علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ یہیں ہمہ وقت شاگردوں کا مجمع رہتا۔ ان کی غزلوں پر اصلاح دی جاتی۔ شعر و شاعری پر بحث ہوتی۔ اخباروں کے لیے مضامین لکھے جاتے۔ مخالفوں کے جواب تحریر ہوتے۔ شاعری کے گلدستوں کی آرائش کی جاتی اور اخبار و رسائل کی ترتیب و تدوین کا کام ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندھیری کوٹھری ادبی اعتبار سے ایک ایسی ذرخیز جگہ تھی، جس میں ہمیشہ رنگ برنگ پھول کھلتے رہتے تھے، جو اپنی بوقلمونی، رنگارنگی اور شادابی سے آج تک حلقۂ ادب کو پُر بہار بنائے ہوئے ہیں۔

اس سچائی کی تصدیق سر عبدالقادر ایڈیٹر ماہنامہ مخزن، لاہور کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے، جنھوں نے بیان کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اپنے مضمون یادِ رفتگاں میں لکھتے ہیں: (۲۶)

''جب جلسہ (کل ہند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، میرٹھ، ۱۸۹۶ء) ختم ہوگیا اورلوگ منتشر ہو گئے اور جو کچھ باقی تھے میرٹھ سے روانگی کی تیاریاں کررہے تھے۔ اس وقت میں اپنے خیمے سے نکلااور سرسید کے خیمہ کی طرف جانے لگا کہ ان سے رخصت ہولوں کہ اتنے میں میری نظرایک پالکی پر پڑی جس میں ایک بزرگ روئی دار انگرکھا پہنے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔ میں اس پالکی کے پاس پہنچا تو کیادیکھتا ہوں کہ حضرت بیان یزدانی ہیں۔ چند سال پہلے ایک دفعہ ان سے ملاقات کا موقع ہوا تھا۔ مرحوم ایک عرصہ سے علیل اور صاحب فراش تھے۔ جب میں نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جب بھی ایک چھوٹے سے اندھیرے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ مگر یہ معذوری ان کی طبیعت کی روانی پر غالب نہیں آئی تھی اوروہ اسی حالت میں دادِ سخنوری دیتے رہے۔ شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح کرتے تھےاوردیگر علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔''

طوطیِ ہند کا اجرا:

اسی ذہنی پریشانی اور مسلسل بیماری کے عالم میں بیان نے یکم جنوری ۱۸۸۱ء کوایک مطبع حدیقۃ العلوم کے نام سے جاری کیا۔ اس کے کاتب شوکت علی اور لوح نویس قائم علی تھے۔(۲۷) انھوں نے اسی پریس سے اسی سال (۱۸۸۱ء) اپنا ذاتی ہفتہ روزہ طوطی ہند جاری کیا جس نے صحافتی دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس میں خبروں کے علاوہ ادبی اورتنقیدی مضامین اورمنظومات بھی شائع ہوتی تھیں۔ طوطی ہند کبھی کبھی اپنے معاصرین سے بھی الجھتا رہتا تھا۔ جس زمانے میں اس کا اجرا ہوا ہے ''اودھ پنچ'' اور ''اخبار فتنہ'' کے درمیان تیز وتند صحافتی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ بیان نے پہلے ''اخبار فتنہ'' کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ حالانکہ بیان کے تعلقات ابتدا میں ریاض خیرآبادی (ایڈیٹر فتنہ) سے بہت اچھے تھے اور نادم سیتاپوری کے بیان کے مطابق:(۲۸)

"ریاض، آزاد (محمد نذیر) اور محمد مرتضیٰ بیان میرٹھی کا اتحادِ ثلاثہ ایک خاموش بساطِ شعروادب بنا ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان ایک مسلسل روز نامچہ گردش کناں رہتا، جس میں نجی زندگی کے علاوہ ادبی اور سماجی زندگی کے چٹخارے بھی ہوتے تھے۔ فل اسکیپ سائز کا یہ روزنامچہ برابر ان تینوں کے گرد چکر کاٹا رہتا تھا اور اس میں یہ تینوں افراد اضافہ کرتے رہتے تھے۔ خانگی مصروفیات اور نجی زندگی کے علاوہ اس ڈائری میں تازہ افکار بھی ہوتے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی۔"

بعد کو منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ سے ٹھن گئی، جس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ بات ضلع جگت سے گزر کر پھکو بازی اور گالی گلوج تک پہنچ گئی۔ اودھ پنچ کے ادارۂ تحریر میں ایک سے بڑھ کر ایک انشا پرداز اور شاعر تھا۔ یہ حضرات بیان کے اخبار طوطیِ ہند کی رعایت سے چڑیا گھر کا تلازمہ اور اصطلاحات استعمال کر کے ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن بیان تنہا ان سب کے اعتراضات کا جواب مختلف ناموں سے نظم ونثر میں دیتے۔ انھوں نے طوطیِ ہند میں اودھ پنچ کے بالمقابل میرٹھ پنچ کے عنوان سے ضمیمے کا اضافہ کیا۔ یہ ہر جمعہ کو چار صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ افسوس کہ طوطیِ ہند اور میرٹھ پنچ کے پرچے اب نایاب ہیں، لہٰذا معرکہ آرائی کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

جناب امداد صابری نے طوطیِ ہند کے خلاف اودھ پنچ کے مضمون کا جو نمونہ اپنی کتاب تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) میں پیش کیا ہے، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، تاکہ معرکہ آرائی کے معیار کا اندازہ ہوجائے۔ مضمون کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے: (۲۹)

نہ بھونکو، تو بتادیں دل میں اپنے کیا سمجھتے ہیں
تمھیں بھی ہم سگِ قصاب کا پلا سمجھتے ہیں
گدھے میرٹھ کے اپنے خر کو بھی عیسیٰ سمجھتے ہیں
پناہِ تاج و گاہِ کشورِ معنیٰ سمجھتے ہیں
دوات اک کوسِ شاہی ہے قلم ڈنکا سمجھتے ہیں

اے ذناب! تو یہ بھول گیا جناب۔ آپ ہی کی مبلغِ استعدادِ حسن لیاقت پر کیا کم شوروغوغا تھا۔ خمسہ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء میں اپنے حضرت استاد کو کیوں گرد آباد کیا! اگر بقول شخصے "خود فراموشی کند نا مے نہد استادرا" کا مضمون ہے تو خیر، اگر واقعی آپ کے استاد جی کا وہ خمسہ تصنیف شریف ہے تو **لاحول ولا قوۃ الاباللہ العلی العظیم**۔ مانتا ہوں مصرعوں کو ایسا گانٹھا ہے، جیسے دیہاتی چمار پھٹا جوتا گانٹھتے ہیں۔ ہر مصرع بادِ ہوائی، گوزِ شتر، کوئی کل درست نہیں۔ الفاظ بے معنی، ترکیب لایعنی، پناہِ تاج وگاہِ کشورِ معنی، کیا خوب، لوندہاے بہ نظرِ ظرافت ترکیب دی گئی ہے۔ کچھ اور نہ سمجھنا۔ الفاظ کے سوا معنی خاک نہیں۔ مصرع ثانی کی ترکیب بھی نئے فیشن کی۔ مصرع ثالث مصرع چہارم کے مقابل میں اگر کوئی ہانک بول اٹھا ہے۔ ابے چمار، پوری فکر کیوں نہ کی۔ اپنے ہی شعر پر مصرعے لگائے ہوتے۔

جناب امداد صابری نے اپنی کتاب میں طوطیِ ہند کے متعلق یہ معلومات دی ہیں: (۳۰)

"یہ ہفتہ وار اخبار میرٹھ سے ۱۸۸۱ء کو ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس کے بانی سید محمد مرتضیٰ صاحب بیان و یزدانی اور مہتمم منشی ولایت علی خان جادو مختار عام مالک مطبع حدیقۃ العلوم، ایڈیٹر سید کرار حسین صاحب روحانی تھے۔ بعد میں اس کے مالک سید سجاد حسین ریحانی ہو گئے تھے۔"

اسی طرح وہ میرٹھ پنچ کے متعلق یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں: (۳۱)

"میرٹھ سے یہ ہفتہ وار اخبار چار صفحات پر ۱۸۸۱ء کو شائع ہوا۔ اس کے جاری ہونے کا جمعہ کا دن تھا۔ مالک مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب بیان و یزدانی، مہتمم ولایت علی جادو، ایڈیٹر سید کرار حسین صاحب روحانی تھے۔ سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ تھا۔ یہ طوطیِ ہند کا ضمیمہ تھا۔"

بیان نے یہ پرچہ اپنے حقیقی ماموں سید مہدی علی کے کہنے پر فرقانی میرٹھی کے بیٹے: سید سجاد حسین

ریحانی/سید کرار حسین روحانی کو فروخت کر دیا تھا۔ جیسا کہ سید مہدی علی کے نام ان کے خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

''حضرت۔ اگر آپ اونچے ہیں تو دامن نیچے رکھئے تا کہ دامن اور ہاتھ کا ساتھ نہ چھوٹے۔ بذل واحتیاج کا رشتہ نہ ٹوٹے۔ خاص آپ کے کہنے سے ہم نے ''طوطی ہند'' بیچ دیا اور بے پر ہو بیٹھے۔ اب مطبع بے آمدنی ہے۔ بعد اس کے آپ نے بات بھی نہ پوچھی۔ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے۔''
(تیغ ہندی، ص:۸۰)

اسی طرح بشیر الدین عاقل کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''طوطیِ ہند، بیچ دیا۔ دریں چہ شک۔ اپنی بلا سے چہ چہ کرے کہ خاموش ہو جائے۔ میرے پاس ہوتا تو تمہارا پاس رکھتا۔ ہم نے دور کیا، تم سے دور رہا۔ طوطے میں وفا کہاں۔ مزاج کیا پوچھتے ہو۔'' (تیغ ہندی، ص:۶۰)

ہماری تحقیق کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۸۳ء کے اواخر کا ہے۔ یوں یہ پرچہ تقریباً تین سال ان کی ملکیت میں رہا اور اس تین سال کے عرصے میں اس نے زبردست ادبی معرکہ آرائی کی اور علمی و ادبی حلقوں میں کافی دھوم مچائی۔ ہمارے خیال سے اس پرچے کو فروخت کر دینے کا اصل سبب ان کی نفسیاتی اور ذہنی بیماری کا غلبہ تھا۔ جب اس کا اثر کچھ کم ہوا تو انھیں ایک نیا رسالہ جاری کرنے کی پھر فکر ستانے لگی۔ ان کی اس فکر کو ان کے خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے شاگرد شاد سہارنپوری کو لکھتے ہیں:

''اے شاد! نقش رہ جائے گا، نقاش مٹ جائیں گے۔ حروف رہ جائیں گے، حریف اٹھ جائیں گے۔ اگر ہمارا اخبار دوبارہ نیا نکلے تو تم سہارن پور میں کے پرچوں کی مدد کر سکتے ہو۔'' (تیغ ہندی: ص:۸۲)

اپنے ایک اور شاگرد ولایت علی جادو کے نام ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''جی چاہتا ہے کہ دوبارہ اخبار جاری کریں۔ اگر تم دس پرچہ لگوا سکو تو زور

لگائیں۔ ورنہ خیر۔ مگر بغیر پیشگی کیوڑہ ندارد۔'' (تیغ ہندی: ص:۸۲)

بیان نے جی ای وارڈ صاحب کمشنر میرٹھ کے نام جو خط لکھا ہے اس میں بھی اس حقیقت کا اظہار ملتا ہے:

''گزارش یہ ہے کہ اگر پچھلی درخواست نامنظور ہے تو ایک اور سہل درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے میں ایک رسالہ شائع کروں گا جس کا نام ''وارڈ نامہ'' ہوگا۔ اس میں کل علمی مضامین نظم ہوں گے۔ اخلاقی اور پولٹیکل و سوشل مضامین بھی نظم میں لکھے جائیں گے۔ لیکن یہ نظم ایشیائی نمونے پر نہ ہوگی جو تکلفات اور مبالغے سے اور جھوٹی باتوں سے بالکل بھری ہوتی ہے۔ بلکہ انسان کے سچ خیال کی تصویر ہوگی۔ اگر آپ اپنے ماتحتوں میں دوسو پرچے اس رسالے کے، بقیمت پیشگی نشر کردو گے، جو حضور کے ایک ادنیٰ اشارے سے با آسانی ممکن ہے تو یہ مبارک علمی یادگار دیر تک ہندوستان کی آنکھوں میں چمکتی رہے گی۔ البتہ کام شروع کرنے کے لیے حضور کو جیب خاص سے بطور پرورش فقط پچاس روپے مرحمت فرمانے ہوں گے۔ اگر حضور اس تجویز کو منظور فرمادیں تو یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے پہلے مجھ کو اس کے بابت اطلاع اور اطمینان ہونا چاہئے۔'' (تیغ ہندی، ص:۸۷)

لسان الملک کا اجرا:

بیان کی یہ آرزو پوری ہوئی اور انھوں نے جون ۱۸۸۷ء کو ماہنامہ لسان الملک جاری کیا۔ اس کا شمار اس زمانے کے معیاری رسائل میں ہوتا تھا۔ ۲۰ صفحات کا یہ ماہنامہ ۲۰/۸×۲۶ سائز پر نہایت ہی اہتمام کے ساتھ مطبع حدیقتہ العلوم میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ سالانہ چندہ دو روپے تھا۔ اس کے مہتمم منشی احمد شفق تھے۔ پرچے کی کتابت وطباعت بھی عمدہ تھی۔ محمد محسن اس کی کتابت کیا کرتے تھے۔ اس میں ہر ماہ دو طرحی مصرعے دیے جاتے تھے۔ مصرع برائے دیوان عام اور

مصرع برائے دیوان خاص۔ شعرا سے دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کی درخواست کی جاتی تھی اور انھیں دونوں عنوان کے تحت موصولہ غزلوں کا انتخاب شائع ہوتا تھا۔ عموماً دیوان خاص کے لیے اساتذہ اور دیوان عام کے لیے مبتدی شعرا غزلیں ارسال کرتے تھے۔ شاید یہ تخصیص اسی لیے تھی۔ بیان کی اردو اور فارسی غزلوں اور دیگر منظومات کے علاوہ اس میں ان کے بیشتر شاگردوں کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ بیان اس کا ادار یہ خود کبھی نظم اور کبھی نثر میں لکھا کرتے تھے۔ وہ جہاں ایک بلند پایہ شاعر تھے، وہیں موثر نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثر نگاری کے کامیاب نمونے لسان الملک کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں ناول نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ جون ۱۸۹۳ء کے شمارے سے ان کا ناول ''خدا پرست کا ناول المسمیٰ بہ گل عباس'' قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا اور یہ سلسلہ آخری شمارے تک جاری رہا۔ اس میں انھوں نے استاد و شاگرد کا مکالمہ لکھ کر تصوف کے رموز و حقائق یعنی خدا کیا ہے، خدا کی صفات اور نبوت و رسالت پر مدلل بحث کی ہے۔ بیان کے اور دو مختصر ناول ''صندلینہ کی سیر'' اور ''عشقِ عظیم'' بھی اسی پرچے میں شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ''حل المطالب'' کے عنوان سے دیوانِ غالب کی شرح بھی قسط وار چھپتی رہی ہے۔ شرح کلام غالب کا سلسلہ دسمبر ۱۸۹۵ء سے شروع ہوا اور ۱۳ غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا کہ بیان کا انتقال ہوگیا۔ ہم نے یہ شرح پہلی بار مرتب کر کے سہ ماہی تحریر، نئی دہلی (شمارہ:۶-۴) میں چھپوا دی ہے۔ یہ ہماری مطبوعہ کتاب: بیان میرٹھی اور غالب میں بھی شامل ہے۔

طوفان:

انھوں نے ایک ظریفانہ رسالہ طوفان بھی جاری کیا تھا، جو لسان الملک کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ اس کے ابتدائی چار شمارے ملے ہیں، جن پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸ ہے۔ ابتدائی تین شمارے آٹھ آٹھ صفحات پر مشتمل ہیں۔ آخیر کا شمارہ ۴ صفحات کا ہے۔ اس میں انھوں نے ایڈیٹر کلال ہند کی اچھی درگت بنائی ہے۔ سرورق کے نصف حصے پر یہ اشعار ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   خنجرِ برّاں پئے دیو رجیم
لشکرِ طوفاں سپسِ قوم راند   خطبۂ لاعاصم الیوم خواند
آج ہے جوش پہ طوفاں میرا   دل ہے جوشان وخروشاں میرا
پھر آواز آنے لگی اے حبیب   کہ نصر" من اللہ فتح" قریب
صورتے گردد مجسم فتح گوید آشکار   لافتیٰ الاعلی لاسیف الا ذوالفقار

پڑھ کے بسم اللہ قدم رکھتا ہوں میں گھسان میں
آج دیکھوں کون ٹھہرے سامنے میدان میں

"ذوالفقار قاتل فجار" (پہلا دم) کے عنوان سے مضمون شروع ہوتا ہے، جس میں کلالِ ہند یکم اگست ۱۸۸۸ء کے کسی مضمون پر سخت اور فحش الفاظ میں تنقید کی ہے۔ نثر کے درمیان چار طنزیہ نظمیں بھی ہیں۔ مسدس طفل شگاف (کھوسٹ اخبار کے مسدس کی چھتاڑ) کے چند بند قلم بند کیے جاتے ہیں:

کھا کھا کے لقمہ ہائے حرامِ ایڈیٹری   گندہ کیا ہے تو نے مشامِ ایڈیٹری
اللہ مینڈکی کو زکامِ ایڈیٹری   تہمت ہے اس کلال پہ نامِ ایڈیٹری
تجھ کو کہاں نصیب مقامِ ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹ ہے کوئی بامِ ایڈیٹری

جا سامنا ہمارا نہ او طفلِ شوم کر   ہفتاد پشت کوتری رکھ دیں گے توم کر
نیزے ہزار چھوڑ دیے ہم نے چوم کر   دنگل میں ہم اٹھائیں گے ہتھیار جھوم کر
تجھ کو کہاں نصیب مقامِ ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹ ہے کوئی بامِ ایڈیٹری

کوسِ فلک میں ہے مرے ڈنکے کا غلغلا   اب تک اودھ میں ہے مری ٹیپوں سے زلزلا
گھٹتا ہے کوئی شیر جوانوں کا ولولا   رہ جائے گا تو پہلے ہی دھکے سے تلملا
تجھ کو کہاں نصیب مقامِ ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹ ہے کوئی بامِ ایڈیٹری

پڑنے لگیں گے چاند پہ جب ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں　　کٹنے لگیں گی او کھلیاں دھائیں دھائیں دھائیں
ہلڑ مچے گا چاروں طرف ہائیں ہائیں ہائیں　　لونڈے یہ بھول جائیں گے سب آئیں بائیں شائیں

تجھ کو کہاں نصیب مقامِ ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹ ہے کوئی بامِ ایڈیٹری

ہم سے نہ او کلال کبھی رنگ لائیو　　محفل میں اپنی دخترِ رز کو نچائیو
اور بن بنو میں جا کوئی اڈا بنائیو　　دیوث ...... پہ تو بھاڑ کھائیو

تجھ کو کہاں نصیب مقامِ ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹ ہے کوئی بامِ ایڈیٹری

سرسید کی تحریک سے دلچسپی:

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کے دل و دماغ پر خوف و ہراس چھا گیا تھا۔ سرسید احمد خان کی مفکرانہ نگاہیں اس حقیقت کو پا گئیں کہ حکومتِ وقت کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کا ترقی کی منزل کو چھونا اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا اور مغربی علوم سے روشناس کرا کے انھیں یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے بالمقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مدرسۃ العلوم، علی گڑھ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جب ۱۸۷۷ء میں لارڈلٹن کے ہاتھوں اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو چاروں طرف سے مخالفت ہوئی لیکن بعض دور اندیش حضرات نے اس تحریک کی ہر طرح سے موافقت کی۔ اسی تحریک کے آخری گروہ میں بیان کا اسم گرامی بھی قابلِ ذکر ہے۔

جس وقت سرسید کی یہ اصلاحی اور تعلیمی تحریک اپنے شباب پر تھی، بیان جوانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے ہر طرح سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اپنی نظم اے قوم اور طالب علموں سے خطاب میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا۔ محمد یحییٰ تنہا کے بیان کے مطابق جب ایک مرتبہ جلسۂ عام نوچندی میں سرسید احمد خاں کو دعوت دی گئی اور وہ تشریف لائے

تو بیان نے سر سید کی شان میں ۳۹ شعر کی اردو میں ایک نظم لکھی جو اس جلسہ میں اکابرین قوم اور بعض صاحبانِ انگریز کی موجودگی میں پڑھ کر سنائی گئی۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں: (۳۲)

تا کجا اے دوستو! خوابِ گراں — آن پہنچا پیشوائے کارواں
چاہیے آنکھیں بچھائیں زیرِ پا — شانِ حق آپ اور ہمارے میہماں
آپ کی تقریر کے اعجاز نے — ڈال دی ہے ہمتِ مرداں میں جاں
زیرِ گردوں پھر وہ گلشن ہو ہرا — آگئی ہے جس کے گوشوں میں خزاں
افتخارِ ہند سید کے قدوم — پھر بھی دکھلائے خداوندِ جہاں

پھر اُٹھے مجلس سے گلبانگِ چیئرس
آئے پھر کاغذ سے آوازِ بیاں

بیان نے کل ہند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میرٹھ (۱۸۹۶ء) کے موقع پر لسان الملک میں اس کانفرنس کی موافقت میں مضمون لکھا اور اکابرینِ کانفرنس کی تعریف میں فارسی کا ایک قصیدہ بھی شائع کیا۔ جس کی اٹھان، الفاظ کے زور و شور اور ترکیبوں کی پختگی کو دیکھ کر قاآنی یاد آتا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر دیکھئے: (۳۳)

ساقی بر آور مے زدن کاوانِ یاراں آمدہ
وز کہساراں قطرہ زن ابرِ بہاراں آمدہ
اردی بہشت آمد کنوں، گلشن بہشت آمد کنوں
از خشت خشت آمد کنوں تا گل در ایوں آمدہ
از گل نشاط انگیختن وز باد عنبر بیختن
از ابر لولو ریختن وز چاک داماں آمدہ
مرغ از طرب دستاں زند، گل خنداں چوں مستاں زند
چقماں درِ بستاں زند برقے کہ رخشاں آمدہ

در مدح سید محمود

ترکانِ تازی را نگر، پیرِ حجازی را نگر
محمود غازی را نگر، با فرّ سلطاں آمدہ

دانش ورش راج کند، دارائے ہندش بج کند
عزت کلاہش کج کند، فرّش فراواں آمدہ

دررُوئے آں شیوہ بیاں،لرزداڈیسن رازباں
پیچیدہ لکنت در دہاں لب زیرِ دنداں آمدہ

تادرادب بکشاہ لب زی درگہش بکشادہ لب
سحباں ز اقصائے عرب ہومر ز یوناں آمدہ

در مدح حسین بلگرامی

آں سید جید حسین، آں مصطفیٰ رانور عین
صدرِ شرف رازیب وزین در بزم اعیاں آمدہ

گویندنامی گوہر است اوبلگرامی گوہراست
لابل گرامی گوہر است کزعدنِ عدناں آمدہ

اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے حجرے سے باہر آ کر کانفرنس کے اختتام پر سر سید احمد خاں سے ملاقات بھی کی اوران کی تحریک کی شانِ میں فارسی کا ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا، یہ کانفرنس ایک خاص شان امتیازی لیے ہوئے دسمبر ۱۸۹۶ء میں نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس میں نامی گرامی ہستیوں نے شرکت فرمائی تھی جن میں نواب محسن الملک ،سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد، میاں محمد شاہ دین، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور سر عبدالقادر کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ بیان کو امید تھی کہ انھیں اس کانفرنس میں نظم سنانے کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ اس امید کے تحت انھوں نے ایک پر جوش مسدس بعنوان اسلام کا سرنگوں علم لکھا تھا۔لیکن محسن الملک نے کانفرنس میں نظمیں سنانے پر پابندی لگا رکھی تھی اس لیے بیان کو دعوت نامہ تک نہیں دیا گیا۔

بیان کی خودداری طبیعت نے بغیر دعوت نامے کے کانفرنس میں شرکت کرنا گوارانہیں کیا اس لیے انھوں نے کانفرنس کے اختتام کے بعد سرسید سے ملاقات کی اور ان سے اور ان کی تحریک سے اپنی دلی محبت کا ثبوت دیا۔ اس سلسلے میں وہ لسان الملک (جنوری ۱۸۹۷ء) میں کانفرنس کا خاتمہ کے عنوان سے ص:۸ پر انتہائی پُر درد انداز میں لکھتے ہیں:

''نواب محسن الملک کا وعید نامہ سنا کہ نظم نہ پڑھی جائے گی۔ ہم نے اپنا ارادہ تہہ کر رکھا۔ ۲۶ دسمبر (۱۸۹۶ء) کو مطلع صاف تھا مگر ہمارا ناظم مکدر۔ ۲۷ کو بارش ہوئی۔ مصمم قصد پر اوس پڑ گئی۔ پھر سنا گیا نظمیں دھڑا دھڑ سنائی جارہی ہیں۔ سمندِ طبع گرمایا لیکن وقت ہم سے آگے چل دیا۔ دوسرے دن کی ٹھہری۔ پھر سیلِ بارش دوڑی آئی۔ ارادہ سیل ہو گیا۔ بعد ۱۲ بجے کے ابر نے راستہ چھوڑ دیا۔ خیال ہوا۔ گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دم۔ خیر جو کچھ رواروی میں ہاتھ آئے غنیمت ہے۔ ناچار چلئے۔ بیمار خانہ یعنی پالکی میں بیٹھ کر، یہ جادہ جا۔ دیکھا کہ خس بالکل کم ہے۔ فقط عطرِ خس باقی ہے۔ سید محمد میر صاحب نے کمالِ اخلاص سے توجہ خاص میں پیش قدمی فرمائی۔ اتر کر سرسید سے ملاقات کی۔ حضرت کرسی پر کوہ شکوہ نظر آتے تھے۔ لالہ خونیں جگر کی طرح ہم بھی دامنِ عزت میں جا جمے۔

اونقد صد تحسیں بکف من جنس دیواں در بغل''

اس سچائی کی تصدیق سر عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن، لاہور) کے مضمون یادِ رفتگاں (مطبوعہ: ادبی دنیا، لاہور، نوروز نمبر ۱۹۲۲ء اور بیداری علی گڑھ، سرسید نمبر مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۲ء) سے بھی ہوتی ہے۔ سر عبدالقادر نے اس واقعے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق سرسید احمد خان مرحوم کی عمر کا آخری دور تھا، جب ان کی قائم کی ہوئی تعلیمی کانفرنس ۱۸۹۶ء کے آخر میں میرٹھ میں منعقد ہوئی۔ اس میں زمانے کی کئی معتبر ہستیاں شریک تھیں۔ اس زمانے میں کانفرنس میں نظموں کے پڑھنے کا رواج تھا۔ لیکن اس کانفرنس میں محسن الملک نے اسے تضیع اوقات سمجھا اور نظمیں

پڑھنے پر پابندی لگادی۔ بیان نے یہ سوچ کر کہ کانفرنس ان کے شہر میں منعقد ہو رہی ہے، ان سے ضرور نظم کی فرمائش ہوگی ایک مسدس: اسلام کا سرنگوں علم کہہ لیا۔ لیکن کسی کو بیان جیسے باکمال کا خیال نہ رہا۔ لہٰذا انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ بیان نے بھی بغیر بلائے شریکِ جلسہ ہونا خودداری کے خلاف سمجھا، لیکن اسے بھی اخلاق و مروت کے خلاف سمجھا کہ سرسید اور سید محمود جیسی عظیم شخصیتیں ان کے شہر میں آئیں اور وہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوں۔ اس لئے بعد اختتام جلسہ ایک پالکی میں بیٹھ کر خیمہ گاہوں تک آئے۔ اتفاقاً انھوں نے (سر عبدالقادر نے) دیکھ لیا اور خود انھیں لے کر سرسید کے خیمے تک گئے۔ اس کے بعد کے واقعات سر عبدالقادر کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

> ''میں نے بیان یزدانی صاحب کو سہارا دے کر پالکی سے نکالا۔ سرسید نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا۔ وہ ان کے قریب کرسی پر متمکن ہوئے۔ کہنے لگے حضرت میں آپ سے تو ملنے نہ آتا کیونکہ آپ نے اپنی کانفرنس کے جلسے میں مجھے میرے شہر میں آ کر بھی یاد نہ فرمایا۔ مگر میں تو آپ کے فرزند سید محمود سے ملنے آیا ہوں۔ آپ کی ملاقات کو بھی جی چاہتا تھا مگر محمود سے ملنے کا زیادہ اشتیاق تھا۔ سید صاحب نے بہت شکریہ ادا کیا اور اپنے ملازم سے کہا۔ جاؤ سید محمود صاحب کو سلام دو اور نواب محسن الملک بہادر کو بھی۔ وہ آدمی پاس کے خیمے کی طرف جانے لگا تو یزدانی صاحب نے ایک چھوٹا سا پرزہ کاغذ کا اپنی جیب سے نکال کر اسے دیا اور کہا ''لو بھئی میرا وزیٹنگ کارڈ سید صاحب کو دے دینا۔'' وہ کارڈ لے گیا۔ تھوڑی دیر میں سید محمود دوڑتے ہوئے آئے اور بڑے تپاک سے یزدانی صاحب سے ملے اور سید صاحب سے کہا ''آپ نے دیکھا میر صاحب نے کارڈ پر کیا لکھا ہے؟'' اور میر صاحب سے کہا ''آپ خود ہی پڑھ کر سنائیے۔'' میر صاحب نے یہ شعر گرج کر پڑھا:

فارغ ز اندوہ و بلِ و اندیشۂ زود آمدم
فردوسِ دہر ستم و در بزمِ محمود آمدم

سب حاضرین نے کہا کہ تقریب ملاقات کا کیسا اچھا راستہ نکالا ہے۔ اتنے میں نواب محسن الملک بھی آ گئے اور وہ بھی حضرت یزدانی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ سید صاحب نے نواب صاحب سے کہا۔ آپ کی مجوزہ اصلاح تو خوب تھی کہ نظموں کو دور سے ہی سلام ہے مگر مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ بھی اور میں بھی اپنے کاموں میں یہ بھول گئے کہ میر یزدانی بیان جو اس زمانہ کے مغتنم لوگوں میں ہیں میرٹھ میں رہتے ہیں اور انہیں دعوت دینی لازم ہے۔ میں تو خود ان کے پاس جاتا اور ان کو ساتھ لاتا۔ انھوں نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ وہ ہمارے چلنے سے پہلے ہم سے ملنے آ گئے ہیں۔ اس پر میر صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ مجھے یہ خیال لے آیا کہ ایسا موقعہ مجھے پھر کب ہاتھ آئے گا کہ آپ سے ملوں۔ میں آپ کے غائبانہ مداحوں میں ہوں۔ اس لئے چند اشعار آپ کی شان میں موزوں ہو گئے تھے وہ سناتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے فارسی کے کچھ اشعار پڑھے۔ جن میں سے دو اشعار مجھے یاد رہ گئے ہیں:

درنگر با چشم دل کایں قوم چوں پیکر بود
سید احمد خاں بہادر پیکرش را سر بود
اختلافِ قوم پیکر را جدا دارد زسر
پیکرے کو سر ندارد در جہاں ابتر بود

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب اگر آپ چاہیں تو میں وہ اردو نظم آپ کو سناؤں جو میں نے کانفرنس کے لیے لکھی تھی اور اگر آپ مجھے بلاتے تو وہاں پڑھی جاتی۔ سب نے سننے کی خواہش کی تو انھوں نے اسلام کا سرنگوں علم کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی پڑھ کر سنائی۔ مجھے اس کے اشعار یاد نہیں ہے۔ مگر یہ یاد ہے کہ وہ بہت پسند کی گئی۔ نواب محسن الملک سب سے زیادہ داد

دیتے تھے۔اور بار بار افسوس کرتے تھے کہ یہ جلسہ میں کیوں نہ پڑھی گئی۔"

جب ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید احمد خان نے اس دنیا سے انتقال کیا تو ان کے دوسرے رفقا کی طرح بیان بھی اس عظیم حادثے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔انھوں نے سر سید احمد خان کا جو مرثیہ کہا ہے وہ ان کے رنج و غم کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔اس مرثیے کے علاوہ بیان نے آٹھ اشعار پر مشتمل فارسی زبان میں ایک تاریخی قطعہ بھی کہا ہے۔اس میں تاریخ کا شعر ہے:(۳۴)

چوں دوئی رفت از میاں، شد سال او

"سید احمد خاں فنا فی القوم گشت" ۱۸۹۸ء

اب مرثیے کے چند اشعار دیکھیے۔لسان الملک سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بیان اپنے حجرے سے نکل کر سر سید کے تعزیتی جلسے (منعقدہ میرٹھ) میں شریک ہوئے اور اس میں یہ مرثیہ پر جوش انداز میں سنایا۔(۳۵)

قہر ہے سر سید احمد خاں بہادر کی وفات ‌ ‌ ‌ وہ زمیں کا فخر جورِ آسماں سے اٹھ گیا

ہے اندھیرا چار سو یارب یہ کیا اندھیر ہے ‌ ‌ ‌ آج نجم الہند کیا ہندوستاں سے اٹھ گیا

راج تیرا لٹ گیا اے قوم اے حرماں نصیب ‌ ‌ ‌ تیرے سر کا تاج تختِ عز و شاں سے اٹھ گیا

بیکسی چھائی ہوئی ہے کیا در و دیوار پر ‌ ‌ ‌ میرِ سامانِ علوم آج اس مکاں سے اٹھ گیا

پھر چراغِ قوم کے انوار دھندلانے لگے ‌ ‌ ‌ ماہتابِ علم آفاقِ زماں سے اٹھ گیا

کون سمجھائیگا سلطاں کو رعیت کی زباں ‌ ‌ ‌ ترجمانِ قوم تختِ حکمراں سے اٹھ گیا

وہ عماد المملکت تھا، وہ ستون سلطنت ‌ ‌ ‌ ہائے قیصر، قیصرِ ہندوستاں سے اٹھ گیا

دن ہمارا کر دیا اے صبحِ پیری تو نے شام ‌ ‌ ‌ مہرِ انور، منزلِ کون و مکاں سے اٹھ گیا

بنتے بنتے علم کا پتلا ادھورا رہ گیا ‌ ‌ ‌ چاند بڑھتا تھا کہ وہ سورج یہاں سے اٹھ گیا

ہائے جس نے ڈال دی تھی قوم کے مردہ میں جان ‌ ‌ ‌ وہ مسیحا دستِ مرگِ ناگہاں سے اٹھ گیا

اے علیگڑھ تیرے ویرانوں کو اب دیکھے گا کون ‌ ‌ ‌ خانہ آرائے ترقی خان ماں سے اٹھ گیا

کیوں نہ کالج میں اڑائے خاک کالج کی بہار ‌ ‌ ‌ باغبانِ علم، صحنِ بوستاں سے اٹھ گیا

جب دیا کاندھا جنازے کو ہوئی بیتاب قوم ‌ ‌ ‌ دھڑ تڑپتا رہ گیا اور سر جہاں سے اٹھ گیا

شعر کیسے، نظم کس کے، نالہ کیا، فریاد کون
شعلۂ آتش دلِ گرمِ بیاں سے اٹھ گیا

وفات:

بیان کو۱۸۹۹ء کے موسم سرما میں بخار آنے لگا۔ پھر کھانسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بخار نے آگے چل کر شدت اختیار کی، جس کے باعث قویٰ اور مضمحل ہو گئے۔ ہمیشہ چار پائی پر ہی بیٹھے بیٹھے ورزش کرنے کے عادی تھے۔ اس عالم میں بھی ان کا یہی معمول رہا۔ اتفاقاً ایک دن ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ نیچے آرہے۔ شدید چوٹ آئی جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ یہ حادثہ ۱۳مارچ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ دلی دروازہ (میرٹھ) کے باہر احمد حسن فرقانی کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں۔ قبر پر کوئی کتبہ یا نشان نہیں ہے۔ بیان کی وفات کے دوسرے دن اخبار انیس ہند میرٹھ (۱۴مارچ ۱۹۰۰ء) کے ایڈیٹر نے انھیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا تھا:

''حضرت بیان نہ صرف شاعرانہ فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز خیال کیے جاتے تھے بلکہ کئی ایک مجموعی باتوں کے لحاظ سے وہ بلا مبالغہ ہندوستان کے نامی شعرا کی فہرست میں فرسٹ نمبر پر جگہ پانے کے مستحق تھے۔ سب سے بڑا کمال ان میں یہ تھا کہ عرصے سے وہ اعصابی مرض میں مبتلا ہونے اور بلا کہیں آنے جانے حتیٰ کہ نشست و برخاست تک سے معذور ہونے کے باوجود زمانے کی ضروریات اور شاعری کے لوازمات سے کماینبغی آگاہ تھے۔ ان کو مدت العمر گھر کی محدود چہار دیواری میں مراقبہ گزیں رہنے پر بھی وہ لاثانی کمال حاصل ہوا کہ دوسروں کو زمانے بھر کی خاک چھان کر بھی میسر ہونا محال ہے۔ یوں تو **الشعراء تلامیذ الرحمن** مشہور بات ہے مگر واقعی امر یہ ہے کہ یہ بات میر صاحب مرحوم ہی میں تھی کہ وہ بلا کسی کے سامنے عرصے تک

زانوئے ادب تہہ کرنے کے تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ اگر وہ ریختہ کے رنگ میں اپنے زمانے کے میر ومرزا تھے تو فارسی میں اپنے عصر کے نظیری وظہوری کہلاتے تھے اور قصائد میں تو یہ حال تھا کہ رشکِ انوری و خاقانی عام طور سے آپ کا لقب مشہور ہوگیا تھا۔ آپ کو نیچرل شاعری کے اندر بھی دستگاہ تھی، چنانچہ آپ کی اکثر تصانیف اس انداز میں موجود ہیں......زورِ طبیعت اور آمدِ سخن کا یہ حال تھا کہ جس وقت چاہتے تھے اپنے دماغ سے کام لے سکتے تھے۔ وہ خود لکھنے سے معذور تھے، مگر جہاں کوئی لکھنے والا ان کے پاس پہنچا اور انھوں نے بے تکان لکھانا شروع کردیا۔ وہ جامع الصفات شخص اور ہمہ داں شاعر تھے۔"

بیان کے انتقال پر متعدد شعرا نے مرثیے اور تاریخی قطعات کہے۔ امیر مینائی نے مصرعۂ ذیل سے تاریخِ وفات نکالی:

"یزداں بخشد جناب یزدانی را" ۱۳۱۷

محمد علی رعب انصاری نے تین تاریخیں کہی ہیں۔ ان میں سے دو یہ ہیں: (۳۶)

ہاں بگو رعب! مصرعِ تاریخ	"حشر زادست ومردہ یزدانی"	۱۳۱۷
تاریخ یہ رعب! لکھ مسیحی	"میرٹھ کا بجھا چراغ اب آہ"	۱۳۱۷

انیس ہند، میرٹھ کے مختلف شماروں میں بیان کے انتقال پر بے شمار تاریخی قطعات اور مرثیے شائع ہوئے ہیں۔ برکت شیر خاں ادیب میرٹھی، منشی پربھودیال عاشق لکھنوی، منشی متصدی لال طرب، جگد مبا پرشاد ہنر جہاں آبادی، منشی مکھن لال شوق، بابو منگل سین بے دل جھنجھانوی، رائے میکو لال عشرت، رئیس لکھنو کے تاریخی مادے دیکھیے: (۳۷)

حق مغفرت کرے مرے استاد کی ادیب	اس مبتلائے غم کی یہ دل سے دعا ہے آج
تاریخ کے لیے دلِ ہمدرد نے کہا	کہدو کہ بادشاہِ سخن مرگیا ہے آج
(ہمدرد - د = ۴) +	۱۳۱۳ = ۱۳۱۷)

یوں دل شکستہ ہو کے دلِ زار نے کہا (زار-الف=۱)
اس ''دہرِ بے ثبات سے ہے ہے بیاں گیا'' (۱۳۱۸-۱=۱۳۱۷ھ)
ہے طرب کے لب سے یہ مصرع بلند (طرب-ط=۹)
''اب گئی میرٹھ سے بس شانِ سخن'' (۱۸۹۱+۹=۱۹۰۰ء)
ادب آموزِ زماں تھے وہ ہنر
لکھ دے تاریخ ''غمِ مرگِ ادیب'' ۱۳۱۷
شوق لکھ تاریخ از روئے الم (الم-الف=۱)
''بے صدا ہے بلبلِ باغِ سخن'' ۱۹۰۰
بیدل از روئے حسرتِ دل گفت (حسرت-ح=۸)
''سمت ایزد گرفتہ یزدانی ۱۳۱۷
بگو عشرت مسیحی سالِ فوتش
''بلبغ الملک رفت اے ہائے ہائے'' ۱۹۰۰

مراثی میں منشی رگھبیر سہائے بریاں جہاں آبادی اور منشی محمد افضل خان افضل کے مرثیے بہت پُر درد ہیں۔ افضل کا مرثیہ دیکھئے: (۳۸)

موت اے بدنہاد و بدکردار ناسزا، نابکار، ناہنجار
بے وفا، حیلہ ساز، دل آزار تیرے ہاتھوں سے ہیں سبھی ناچار
تو نے چن چن کے دیکھ او سفاک
اچھے اچھوں کو کر دیا تہہِ خاک
میں بھی مدت سے تیرا مہماں ہوں گوسکوں ہے مگر پریشاں ہوں
ہر گھڑی فرطِ غم سے نالاں ہوں لوگ ہنستے ہیں اور میں گریاں ہوں
دلِ محزوں تھا پہلے ہی ناشاد
تو نے اور اس پہ او ستم ایجاد

تازہ اک اور داغ دکھلایا حرکتوں سے نہ اپنی باز آیا
بے حیا کچھ نہ دل میں شرمایا ہاں مجھے کھو کے تو نے کیا پایا
تیرے عیش وطرب کو آگ لگے
تیرے قہر وغضب کو آگ لگے

یعنی وہ میرے مہرباں استاد مہرباں اور قدرداں استاد
اہلِ میرٹھ کی عز وشاں استاد کہتے تھے سب جنہیں بیاں استاد
مارچ تیرہ کو وہ جواں اقبال
پنجۂ مرگ سے ہوا پامال

ہائے وہ بزمِ اہلِ فن کی بہار ہائے وہ گلشنِ سخن کی بہار
ہائے وہ شاہدِ چمن کی بہار ہائے وہ باغِ پنجتن کی بہار
صرفِ نذرِ بلائے جاں ہو جائے
چار ہی روز میں خزاں ہو جائے

وہ سپہرِ سخنوری ہیہات بحرِ ذخّارِ شاعری ہیہات
فخرِ جامی و انوری ہیہات رشکِ عرفی وعنصری ہیہات
نیرِ عزّ و اعتلا افسوس
برجِ خاکی میں چھپ گیا افسوس

طوطیِ گلشنِ سخن دانی بلبلِ گلشنِ گل افشانی
خسروِ کشورِ غزل خوانی گوہرِ افسرِ ہمہ دانی
غیرتِ انوری و خاقانی
رشکِ غالب، بیان و یزدانی

آفتابِ سپہرِ جاہ و جلال بادشاہِ دیارِ فضل و کمال
ناثر و ناظم و بلند خیال شاعرِ بے عدیل، بے تمثال

چشمۂ فیض، شہرۂ آفاق
معدنِ حلم و مخزنِ اخلاق
اخترِ سعدِ آسمانِ علوم گوہرِ آبدارِ کانِ علوم
گلِ خوشرنگ، گلستانِ علوم روشنی بخش خانمانِ علوم
منشیِ بے نظیر و لاثانی
عزت افزاے نامِ فرقانی
کارزارِ سخن کا تھا وہ مرد فرد میں لائقوں کے تھا بس فرد
گرم مضمون وہ کہ دل ہو سرد سن کے حاسد کا رنگِ رخ ہو زرد
حسنِ بندش جو دیکھ پائے وہ
ساری ترکیب بھول جائے وہ
ہو رقم غم کی داستاں کیونکر شق ہوا جاتا ہے قلم کا جگر
کانپتا انگلیوں میں ہے تھر تھر ہاں اسی پر اب اکتفا ہے مگر
کر دعا ہاتھ اٹھا کے اے افضل
بخشدے ان کو ربِ عزو جل

شخصیت:

بیان شکل وصورت کے اعتبار سے بہت حسین وجمیل تھے۔ اسی لیے لوگ ان کے بچپن میں انھیں ''لالہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ انھیں دنیاداری کی مطلق پرواہ نہ تھی، چنانچہ عمر بھر شادی نہ کی۔ طبعاً آزادی پسند تھے۔ لباس اور خورد ونوش میں تصنع، آرائش یا تکلف کے پابند نہیں تھے۔ بے فکری سے زندگی بسر کرنا اور علم وادب کی خدمت کرنا ان کا نصب العین تھا۔ ان کے مزاج میں استقلال بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ بڑے صلح کل، پاک باطن اور ظریف الطبع تھے۔ جناب امداد صابری نے اپنی تصنیف دہلی کی یادگار ہستیاں:۸۲، میں بیان کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ

سید آفتاب حسین ساکن پتن کھیڑا (بجنور) ان سے ملنے گیے۔ جب مکان پر پہنچے تو آواز دی۔ بیان نے پوچھا کون ہے؟ جواب میں مولوی صاحب نے کہا" آفتاب"۔ بیان نے کہا مغرب کے بعد آفتاب کیسا؟ مولوی صاحب نے فرمایا:" مرتضٰی کے واسطے مراجعت کر رہا ہوں۔"

خلوص، تواضع، ہمدردی اور بے تعصبی ان کے فطرت کا خاصہ تھی جس کا ثبوت ان کے غیر مسلم احباب و تلامذہ کی کثیر تعداد سے فراہم ہوتا ہے۔ سنجیدہ مسائل پر غور و فکر کے بعد لکھنے کے عادی تھے لیکن اگر کوئی انھیں چھیڑتا تو وہ پھر کسی کے دوست نہیں تھے، وہ وہ گل افشانیاں کرتے کہ حریف بوکھلا جاتا۔ ایڈیٹر اور صحافی کی حیثیت سے سیاسی اور ملکی معاملات سے بھی باخبر رہتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ ادیب اور شاعر تھے اور انھیں شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ اور کسی چیز سے ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کی اندھیری کوٹھری ہی ان کی کائنات تھی۔ اسی لیے بعض احباب انھیں "گوڈر کا لعل" کہا کرتے تھے۔ ان کی ادبی تخلیقات وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھی جاتیں اور اس وقت کے موقر جرائد و رسائل کے مدیر صاحبان ان کی تحریروں کے ساتھ، ان کے نام سے پہلے صباح الملک ہمدانی، سید الشعرا، طوطی ہند، بلیغ الملک، رشکِ انوری وخاقانی، حسان الہند، سحبان العجم جیسے گرانقدر القاب کا اضافہ کرتے تھے۔ بیان جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز پر جوش، موثر اور پر کیف تھا۔ آغا شہر لکھنوی اپنے ایک مضمون:" جذباتِ شعر کا اظہار" میں لکھتے ہیں: (۳۹)

> "ایک مرتبہ مرحوم (بیان) کے نامی شاگرد ضمیم بلند شہری سے میں نے ان کی طرز شعر خوانی کے متعلق پوچھا، تو انھوں نے کہا کہ استاد مرحوم الفاظ پر زور دے کر پڑھتے تھے اور آواز میں بھی ایک خاص جذب کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کے بعد ضمیم مرحوم نے اس رنگ میں ایک شعر پڑھ کر سنایا، واقعی جوشیلی طرزِ ادا تھی۔"

تصانیف:

بیان اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا خاصا کلام طوطی ہند، لسان الملک،

طوفان اور جلوۂ یار میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں کئی مختصر کتابچے طبع کروائے تھے، جن میں سے سات کتابچوں کے نام مختلف ذرائع سے معلوم ہوئے ہیں: ۱۔ پانچ ہند (بجواب شکوۂ ہند حالی)، ۲۔ جرمانۂ آفتاب (مثنوی)، ۳۔ مجموعہ عطر نعت (نعتیہ کلام)، ۴۔ رخصتِ عروس (ایشیائی شاعری کی الوداع)۔ ۵۔ پنجۂ فولاد، ۶۔ حواسِ خمسہ، ۷۔ یادگار یزدانی (فارسی کلام)۔ نثر میں بیان کی چار تصانیف کا پتا چلتا ہے۔ حل المطالب (شرح دیوان غالب) اور گل عباس (خدا پرست کا ناول)۔ یہ دونوں کتابیں لسان الملک میں قسط وار شائع ہو رہی تھیں لیکن بیان کا انتقال ہو جانے کے باعث نامکمل رہیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف میں غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ شرح قانون بوعلی سینا اور تیغ ہندی (خطوط کا مجموعہ) ہے۔ اول الذکر کا نسخہ نذرِ دیمک ہو چکا ہے۔ ثانی الذکر کا قلمی نسخہ اچھی حالت میں ہے اور فل اسکیپ سائز کے ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سید مہدی علی، مولوی حسین احمد، سید یعسوب الدین، سید سلطان الحق، ولایت علی جادو، بشیر الدین عاقل، منشی عبدالحامد، مرزا عنایت علی اثر، سجاد حسین ریحانی اور دیگر تلامذہ، احباب اور رشتے داروں کے نام بیان کے خطوط ہیں۔

بیان نے محمد حامد حسین کے نام جو خط لکھا ہے، اس کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جرعۂ جام کے نام سے ایک منظوم رسالہ بھی شائع کروایا تھا۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام کی اشاعت کے لیے بہت فکر مند تھے۔ لکھتے ہیں: (۴۰)

> ''حواس خمسہ اور جرعۂ جام، یہ دونوں رسالے میرے دورِ اول کے کارنامے تھے۔ بلکہ مرضِ محبت کا ہذیان تھا۔ جرعہ یار لوگ اڑا گیے، حواسِ خمسہ دوستوں اور خریداروں کے ہاتھوں پریشان ہو گئے۔ خاص میرے پاس بھی نہیں ہے اور بعد تلاش معلوم ہوا کہ بازار اب اس یوسفِ ثانی سے خالی ہے۔ لیکن اگر مل گیا تو فوراً بھیج دوں گا۔ والد آپ کے کس طرح ہیں۔ افسوس ہے کہ ہنر بے دولت ترقی نہیں کرتا۔ اہلِ ہنر بے دولت ہیں اور اہلِ دولت بے ہنر۔ فی الحال ایک مثنوی جرمانۂ آفتاب توحید کے

بارے میں لکھی ہے۔ مگر اخراجاتِ ضروری سے نہ چھپنا محال ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے۔"

بیان اپنے کلام کے اشاعت کے سلسلے میں کس قدر فکر مند تھے اس کا اندازہ تیغ ہندی کے اس آخری خط سے بھی ہوتا ہے جو صرف القاب و آداب سے شروع ہوتا ہے۔ دیکھئے: (۴۱)

"پشت و پناہ اسلام و اسلامیاں دامت برکاتہم

افسوس خونِ جگر، غمِ بے اختیاری سے خشک ہوگیا ورنہ یہ عریضہ میں اپنے خون جگر سے ہی لکھتا۔ آپ کا عروجِ ہمت اور اس کا آوازۂ بلند میں سن چکا ہوں۔ آپ کے دل میں ہمدردی ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مروت گوشہ گیر ہے۔ فیاضی آپ کے دست بوسی کو اپنا شرف سمجھے ہوئے ہے......

کیا عجب ہے کہ آپ مجھے کسی نہ کسی تقریب سے جانتے ہوں گے۔ میں ایک سوگ نشیں ہوں کہ اپنے معنوی بیٹوں کے ماتم میں خاک اڑاتا ہوں اور نگاہ مایوس سے چارطرف دیکھتا ہوں کہ کوئی علوئے ہمت، جواں مرد، جس کے دل میں روح القدس نے دم پھونکا ہوآئے اور میری گود میں جو میرے بچوں کی لاشیں دھری ہیں، ان میں ایک جنبش لب سے جان ڈال دے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ متین زندہ ہوکر اپنے جلانے والے کا قیامت تک دم بھرتے رہیں گے۔ آپ کا نادیدہ، خاک راہ: سید محمد مرتضٰی بیان ویزدانی، مالک مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ۔"

بیان کے انتقال کے وقت ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مسودہ ان کے شاگرد پروفیسر سید محمود علی گرامی کے قبضے میں تھا۔ وہ عرصے تک اس کی تدوین میں مصروف رہے لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ البتہ اصناف سخن کے لحاظ سے انھوں نے تین کتابیں، عطر مجموعہ نعت (نعتیہ کلام کا مجموعہ)، رنگ شہادت (مراثی اور سلام کا مجموعہ) اور جواہر لاثانی (نیچرل نظموں کا مجموعہ) شائع کروائی تھیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بھی پاکستان سے بیان کے تین مجموعہ کلام:

قندیل حرم (نعتیہ کلام کا مجموعہ)، رنگ شہادت (مراثی اور سلام کا مجموعہ) اور نقش بیان (غزلوں کا مجموعہ مع حواس خمسہ) شائع کروائے ہیں۔ میں نے جب بیان کے متعلق تلاش و تحقیق شروع کی تو چھ کتابیں: یادگار یزدانی، جرعۂ جام، پنجۂ فولاد، حواس خمسہ، جواہر لاثانی اور نقش بیان کے علاوہ مجھے بیان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام مختلف ذرائع سے مل گیا ہے۔ انھی کی مدد سے میں بیان میرٹھی حیات و شاعری، بیان میرٹھی اور غالب، بیان میرٹھی کی جدید نظمیں اور دیوانِ بیان میرٹھی شائع کروا کے منظر عام پر لا سکا ہوں۔

تلامذہ:

بیان کے تلامذہ کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ بیان مسلم الثبوت استاد، پختہ مشق اور فطری شاعر تھے۔ لہٰذا نو مشق شعرا زیادہ تر انھیں کے پاس اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ ان کے اکثر شاگرد خوش گو، خوش فہم ہوئے ہیں۔ لسان الملک اور مختلف ذرائع سے ان کے مندرجہ شاگردوں کا پتا چلتا ہے:
مولانا اکبر وارثی میرٹھی، مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی، منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی، منشی رگھبیر سہائے بریاں جہاں آبادی، حافظ کریم بخش آزاد میرٹھی، منشی شیخ علی حسن صمیم بلند شہری، مولوی سید محمود علی گرامی، منشی بال سروپ شکن، خان بہادر بشیر الدین تسخیر میرٹھی، احمد جان تبسم، نور الحسن یاس، اختر خیر نگری، مولانا سید سراج احمد سراج الدنی، منشی بہادر خان ناچیز، منشی موہن لال خمار، منشی برکت شیر خاں ادیب، منشی اصغر حسین قمر، سید زوار حسین شرر، منشی بدیع الدین جوہر، منشی حیدر حسین خفی امروہی، منشی عبدالحکیم محشر، افضل خان افضل، منشی محمد ولایت علی جادو، منشی رام پرشاد شاد سہارنپوری، انور میرٹھی، زار میرٹھی، منشی طفیل حسین تعلیٰ، نور میرٹھی، شمس الدین شمس میرٹھی، سلامت اللہ خاں سالم، جگدمبا پرشاد ہنر جہاں آبادی، منشی پربھو دیال عاشق لکھنوی، حافظ الہٰ بخش قابل، منشی ریاض الحسن طلعت، محمد علاء الدین جلالی، علی احسن خان بسمل، مشیت خاں مشیت، میر سید علی شیدا، شیخ نجات علی تاثیر، شیخ علی حسن قلاش و مفلس، عبدالحق قمر۔

شاعری:

بیان اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں قدیم و جدید کی آمیزش تھی۔ ایک طرف ناسخ کی شاعری کا رنگ عام ہو چکا تھا، انیس و دبیر اپنی شہرت کے دائمی نقوش بنانے میں سرگرمِ عمل تھے، ذوق، غالب اور مومن کا آخری زمانہ تھا اور داغ و امیر میدانِ شاعری میں اپنے اپنے کمالات کا ڈنکا بجا رہے تھے۔ دوسری طرف آزاد، حالی اور اسمٰعیل میرٹھی جدید شاعری کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے۔ بیان کی تربیت اور تعلیم گو مشرقی تھی، مگر شعوری اور سماجی اعتبار سے وہ زمانے کی بدلتی قدروں سے متاثر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری کی اساس، روایت و جدیدیت پر رکھی، جس سے ان کی شاعری قدیم و جدید خیالات کا حسین سنگم بن گئی۔

بیان نے روایت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے غزلیں، نعت، مراثی، قصائد، سہرے، قطعات اور رباعیات کہی ہیں اور شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنا کر جدید قسم کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کے معاصرین ناسخ، آتش، غالب، مومن، امیر مینائی اور داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ قصائد میں سودا کا تتبع کیا ہے اور سلام و مراثی میں انیس و دبیر کا۔ نیچرل شاعری میں وہ آزاد، حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ روز مرہ زندگی اور تہواروں سے متعلق نظمیں ان کے تجرباتِ حیات اور قوتِ مشاہدہ کی آئینہ دار ہیں اور شاعرانہ مصوری کی نادر مثال۔ یہ نظمیں بے حد سادہ اور سلیس زبان میں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیان کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ ایک وہبی اور وجدانی شاعر تھے اور انھیں زبان و بیان پر کامل عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صداقت، تاثر اور جذبات کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ لالہ سری رام ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: (۴۲)

> ''بیان میرٹھ کے نامور اور قابل شعرا میں تھے۔ استعدادِ علمی بہت معقول اور فنِ سخن میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ مزاج بہت آزاد اور بے باکانہ پایا تھا۔ نظم و نثر پر قادر تھے۔ مبدِ فیاض سے شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا۔ فارسی کلام سے بہت ذوق تھا اور اس سے نہایت

قابلیت کے ساتھ دادِ سخنوری دی ہے۔ جملہ اصناف پر قادر تھے۔ ایک عجیب کمال ان کی ہمہ گیر طبیعت میں یہ تھا کہ جس رنگ میں چاہتے تھے، فکرِ سخن کرتے اور پھر یہ نہیں کہ قافیہ پیائی ہو، بلکہ فی الحقیقت اس رنگ میں اپنے زورِ طبیعت سے وہ وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ مثلاً ان کے بعض شعر مرزا غالب کے رنگ میں ایسے لاجواب ہوتے تھے کہ اجنبی کو مرزا غالب کے کلام کا دھوکا ہو جاتا تھا۔"

پیارے لال شاکر میرٹھی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں: (۴۳)

"حضرت بیان کی شاعری کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ اپنے فضائل و محاسن کمال کے وسیلہ سے اس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی شاعروں کے منتہائے نظر سے بھی ادھر ہے۔ علمیت، دماغی قابلیت، طبع کی جولانی، فکر کی بلندی، خیالات کی نیرنگی، یہی باتیں ہوتی ہیں جو شاعر کے کلام کو مستند اور قابلِ قدر بنا دیتی ہیں اور انھیں اوصاف کی بدولت بیان نے بھی اپنی لافانی عظمت کا سامان مہیا کر لیا ہے...... بیان کے کلام پر غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر میدان کے مرد تھے۔ پُر گوئی کے ساتھ مضامین آفرینی کا پہلو عموماً نظر انداز ہو جاتا ہے لیکن بیان نے سب کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے، بہت زیادہ کہا ہے...... بیان کے ایک پختہ کار سخن گو ہونے کی اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جس رنگ میں چاہتے تھے بے تکلف کہتے تھے۔ زبان پر انھیں خاصہ قابو تھا۔ وزن دار اور موزوں الفاظ گویا ان کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ خیالات کی گوناگوں کیفیات کبھی میر کے رنگ میں نظر آئینگی کبھی غالب کے۔ کہیں ذوق کی شوخیِ بیاں کا لطف حاصل ہوگا۔"

امروز کے مقالہ نگار خدا بندہ نے بیان کی شاعری پر اس طرح تبصرہ کیا ہے: (۴۴)

''بیان کسی کے شاگرد نہیں تھے، البتہ ان پر دلی اور لکھنو دونوں کے اساتذۂ فن کا اثر پڑا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کی غزلوں سے ناسخ کا رنگ جھلکتا ہے۔ یعنی اسی قسم کی موشگافیاں ہیں، وہی خارجیت۔ لیکن سارے کلام کا یہ حال نہیں۔ اکثر مقامات پر انھوں نے بڑے سیدھے سادے اور صاف شعر بھی کہے ہیں، جن میں نہ الفاظ آرائیاں ہیں اور نہ کہیں لکھنوی تکلف اور تصنع کا پتا چلتا ہے...... بیان اگر چہ شاعری میں ناسخ اور وزیر وغیرہ سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں اور انھوں نے ان شعرا کے اشعار کی تضمین بھی کی ہے تاہم ان پر علی گڑھ کی علمی تحریک کا بڑا اثر پڑا تھا اور وہ جدید شاعری سے بہت متاثر تھے۔ جس کے سب سے بڑے علم بردار حالی اور آزاد تھے۔ چنانچہ انھوں نے امید، سردی وغیرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ حالی کے تتبع میں قومی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ''ایشیائی شاعری کی الوداع'' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی ہے۔''

مدثر حسین ان کی شاعری پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: (۴۵)

''بیان میرٹھی تمام عمر شعر گوئی کرتے رہے لیکن آپ کا کلام نایاب ہے۔ چند غزلیں، جو دستیاب ہوسکی ہیں، ان سے بیان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیان میرٹھی نے حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کی طرح غزل، نظم، مثنوی، مسدس، مرثیہ اور رباعی وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی میں بھی اپنے رہوارِ قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ وہ فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے، چنانچہ بعض جگہ ان کا نام بیان یزدانی تحریر ہے۔

بیان یزدانی نے شعر و سخن کی بدلتی ہوئی ہواؤں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے عہد کے زبردست نبض شناس تھے۔ اپنے معاصرین میں وہ صفِ اول کے شعرا میں شمار

کیے جاتے تھے۔ حالی سے معاصرانہ چشمک اور اودھ پنچ سے جھڑپوں کی ہمت کسی ایسے ہی شخص میں ہوسکتی تھی، جو زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہو، اعلیٰ پائے کا شاعر ہو، زبردست ادیب ہو اور صحافی بھی۔ بیان یزدانی میں یہ تینوں صفات مجتمع ہوگئی تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام اس وقت کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا تھا۔"

بیان کے کلام پر بالاستعیاب نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں وہ تمام خصوصیاتِ شاعری اور لوازماتِ فن موجود ہیں جو کسی بڑے اور کامیاب شاعر کی شہرت یا بقائے دوام کا باعث ہوتے ہیں۔ نازک خیالی، تناسب لفظی، معنی آفرینی، بداعتِ اسلوب، تخیلِ پرواز، ندرتِ خیال، جوشِ جذبات، شاعرانہ مصوری ومحاکات، صنائع بدائع، غرض کیا ہے جو ان کے کلام میں موجود نہیں! ان کے ہمعصروں میں بلاشبہ بڑے بڑے نام ہیں اور تاریخ ادب میں وہ آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک نا قابلِ فراموش حقیقت ہے کہ بیان کا درجہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔ کیا خوب کہا ہے سرور جہاں آبادی نے:

میر و مرزا سے زیادہ ترا رتبہ نہ سہی
ان سے کم تھا ترا پلّہ یہ کہیں ہم کیوں کر
چوم لیتی تھی فصاحت ترا منہ وقتِ کلام
اے بیاں ختم تھی، اعجازِ بیانی تجھ پر

حواشی:

۱۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی)، اگست ۱۹۹۲ء، ص: ۳۶ (بیان یزدانی از امان اللہ خان شیروانی)
۲۔ روزنامہ امروز (کراچی)، ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص: ۷ (بیان و یزدانی مرحوم از خدابندہ)
۳۔ قندیلِ حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۷۴ء)، ص: ۵: ماہنامہ تحریک (دہلی)، جولائی ۱۹۷۷ء، ص: ۳۵ (بیان میرٹھی از محمد مشتاق شارق)

مراۃ الشعرا (جلد دوم) کے مصنف محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے کہ بیان کا مکان محلّہ چار دروازہ (میرٹھ) میں تھا۔

۴۔ فکر و ریاض از علی جواد زیدی مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی (۱۹۷۵ء) مضمون: غالب کا ایک ہم عصر (سید احمد حسن فرقانی وشاکی)، ص: از ۱۶۳ تا ۲۱۶

۵۔ فکر و ریاض از علی جواد زیدی

۶۔ فکر و ریاض از علی جواد زیدی

ماہنامہ نقوش، مکاتیب نمبر (۲)، ص: ۴۶۵

خم خانۂ جاوید (جلد سوم) از لالہ سری رام، ص: ۶۰۲

ماہنامہ آج کل (نئی دہلی)، فروری ۱۹۵۹ء (کچھ غالب کے بارے میں از فرخ جلالی) ص: ۳۷

۷۔ فکر و ریاض از علی جواد زیدی، ص: ۱۸۰

۸۔ یہ شجرہ جناب امداد احمد خان زبیری (مرحوم) سے فراہم ہوا تھا۔ اس میں نئی معلومات کی روشنی میں چند اضافے کئے گئے ہیں۔

۹۔ ماہنامہ لسان الملک، میرٹھ، مارچ اپریل ۱۸۹۳ء

بیان میرٹھی کی جدید نظمیں، مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، مطبوعہ علیم پرنٹرس، مومن پورہ، ناگپور (۲۰۰۰ء) ص: ۱۹۲

۱۰۔ ماہنامہ لسان الملک، میرٹھ، مئی ۱۸۹۳ء

۱۱۔ تذکرۂ شاعرات از شفیق بریلوی، ص: ۲۳۷

۱۲۔ ماہنامہ العصر (لکھنو)، اگست ستمبر ۱۹۱۳ء (سید محمد مرتضیٰ بیان ویزدانی میرٹھی از پیارے لال شاکر میرٹھی)

روزنامہ امروز (کراچی)، ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص: ۷

ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) ستمبر ۱۹۷۰ء، ص: ۲۳ (بیان میرٹھی از مدثر حسین)

۱۳۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء، روزنامہ امروز (کراچی) ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء

ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) ستمبر ۱۹۷۰ء، ماہنامہ تحریک (نئی دہلی) جولائی ۱۹۷۷ء
قندیلِ حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین، رنگِ شہادت مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین

۱۴۔ فکرِ ریاض از علی جواد زیدی، ص: ۱۶۵، ۱۶۷

۱۵۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء، قندیلِ حرم مرتبہ سید صفدر حسین، ص: ۵

۱۶۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) اگست ۱۹۹۲ء، ص: ۳۷

۱۷۔ فکرِ ریاض از علی جواد زیدی، ص: ۱۹۷

۱۸۔ ماہنامہ لسان الملک (میرٹھ) مارچ تا اگست ۱۸۹۸ء
بیان میرٹھی کی جدید نظمیں مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ص: ۱۸۰

۱۹۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی)، اگست ۱۹۹۲ء، ص: ۳۷

۲۰۔ قندیلِ حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین، ص: ۶

۲۱۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء

۲۲۔ بیان میرٹھی کی جدید نظمیں مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ص: ۱۷۴

۲۳۔ تاریخِ صحافت اردو (جلد دوم) از امداد صابری، ص: ۱۵۳
قندیلِ حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین
ماہنامہ تحریک (نئی دہلی) جون ۱۹۷۷ء

۲۴۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء

۲۵۔ روزنامہ امروز (کراچی) ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء
خم خانۂ جاوید (جلد اول) از لالہ سری رام، ص: ۶۲۴
ماہنامہ تحریک (نئی دہلی) جولائی ۱۹۷۷ء

۲۶۔ ادبی دنیا، لاہور (نوروز نمبر) ۱۹۲۲ء
بیداری، علی گڑھ (سرسید نمبر) ۲۴ مارچ ۱۹۴۲ء، ص: ۱۹

۲۷۔ ہندوستانی پریس از نادر علی خان، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو (۱۹۹۰ء) ص: ۳۷۶

۲۸۔ انتخاب فتنہ مرتبہ نادم سیتاپوری، ص:۱۳، ۱۴

۲۹۔ تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) از امداد صابری، حیدر پرنٹنگ پریس، دہلی، ص:۱۱۷

۳۰۔ تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) از امداد صابری، ص:۲۰۷

۳۱۔ تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) از امداد صابری، ص:۲۰۶

۳۲۔ مراۃ الشعرا (جلد دوم) مولفہ محمد یحیٰ تنہا، ص:۱۴۲، ۱۴۳

۳۳۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء

۳۴۔ ہماری زبان (نئی دہلی) ۸ مارچ ۱۹۶۵ء

۳۵۔ ماہنامہ لسان الملک (میرٹھ) مارچ اپریل ۱۸۹۸ء

۳۶۔ کلیاتِ رعب مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو (۱۹۲۲ء) ص:۲۵۰

۳۷۔ انیس ہند (میرٹھ) ۲۱ مارچ ۱۹۰۰ء، ۱۴ اپریل ۱۹۰۰ء

۳۸۔ انیس ہند (میرٹھ) ۲۸ مارچ ۱۹۰۰ء، ص:۱۰

۳۹۔ ماہنامہ مرقع (لکھنو) دسمبر ۱۹۲۶ء

۴۰۔ تیغ ہندی (قلمی) از بیان میرٹھی، ص:۱۱۱

۴۱۔ تیغ ہندی، ص:۱۱۸

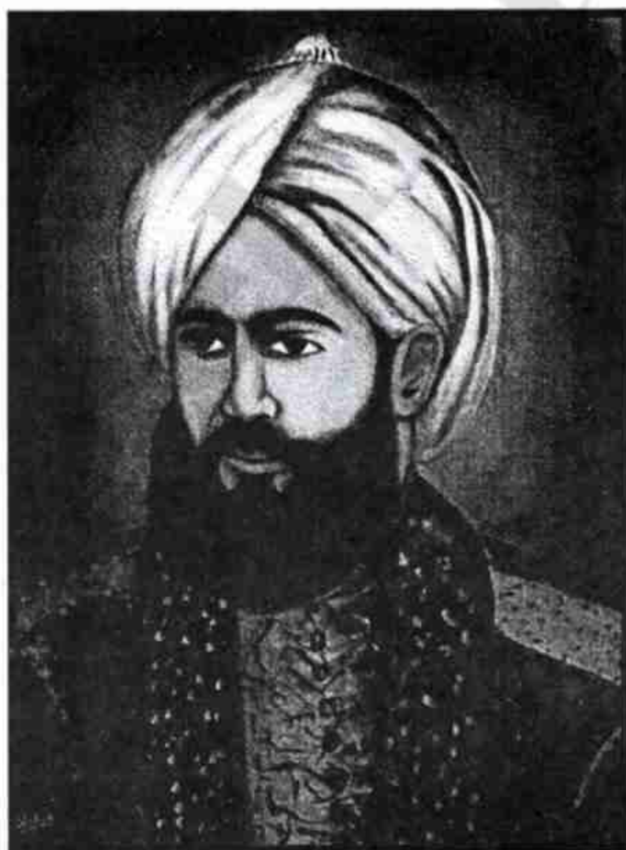
۴۲۔ خم خانۂ جاوید (جلد اول) ص:۶۲۴

۴۳۔ ماہنامہ العصر (لکھنو) اگست ستمبر ۱۹۱۳ء

۴۴۔ روزنامہ امروز (کراچی) ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء، ص:۷

۴۵۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) ستمبر ۱۹۷۰ء، ص:۲۳، ۲۴

دیوانِ بیان



بیان میرٹھی

بیاں ہے وہ بادشاہِ اسریٰ کہ جس کی درگاہِ خسروی میں
دیا زمینِ ادب کو بوسہ فلک نے گردن جھکا جھکا کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزلیات

﴿۱﴾

بہارِ حمد سے دیواں ہے گلزارِ ارم میرا
خطِ گلزار میں بادِ بہاری ہے قلم میرا

سنا ہے مژدۂ جاں بخش جب سے نحنُ اقرب کا
رگِ گردن کے پاس آتے ہی رک جاتا ہے دم میرا

ہوا ہوں آپ سے خالی تو کیا معمور ہوں تجھ سے
کہ دم بھرتا ہے تیرا قالبِ خاکی میں دم میرا

ملا اعزاز کیا کیا دولتِ حمدِ الٰہی سے
چلے گا بادشاہوں سے نہ اب جھک کر قلم میرا

﴿۲﴾

کوڑا ہے، عکس گیسوے مشکینِ یار کا
گھوڑا بھی شوخ ہے، مرے گل گوں عذار کا

احساں قفس میں ہے، یہ دلِ داغدار کا
بلبل کے ساتھ قید ہے، موسم بہار کا

حشر اُن کی زلف و رخ نے کیا ہو چکا جہاں
ٹوٹا طلسم، گردشِ لیل و نہار کا

کس رشکِ مہر و ماہ کا آوارہ گرد ہوں
ہے آسماں لقب، مرے مشتِ غبار کا

وحشت نے کھینچ لی ہیں طنابیں زمین کی
خیمہ فلک سے دور ہے اپنے غبار کا

ٹوٹا وہ اور میں دشتِ قیامت میں گر پڑا
گردوں غبار تھا، مرے مشتِ غبار کا

خشکی میں ڈوبتا ہوں ٹھہر، سوزِ دل ٹھہر
پانی ہوا جگر، مرے سنگِ مزار کا

بے درد آسماں نے رکھا اس کا نام برق
پارا اڑا جو میرے دلِ بے قرار کا

اس نوجواں کے رخ سے کہاں تابِ ہمسری
خورشید حشر پر ہے گماں نے سوار کا

رکھا ہے پاؤں واں، ترے مشتاقِ دید نے
ہے شمعِ طور نام جہاں خار خار کا

آئے وہ شامِ وعدہ تو آتے ہی چل دئے — پرسہ نہ دے گئے، دلِ امیدوار کا

اُٹھے زمیں سے لالۂ خونیں کفن کی طرح — محشر ہے ایک کھیت شہیدانِ یار کا

رکھتا ہے چرخ صاحبِ جوہر سے کاوشیں — کٹ کٹ کے بک رہا ہے جگر کوہسار کا

ارشاد بزمِ شعر میں ہو، اے بیاں کچھ اور
مشتاق ہے جہاں، سخنِ آب دار کا

﴿۳﴾

شعلہ ہے، مہر جس کے دمِ سبحہ یار کا — محشر وہ اژدھا ہے، مرے شامِ تار کا

اے اہلِ سبحہ، چھیڑ نہ زنار بند کو — دانا کو پاس چاہیے ہر رشتہ دار کا

کی کوہ کن نے کوہ کنی، یاں ہے جاں کنی — اس خوں کدے میں کام نہیں شیر خوار کا

مستوں کو اس کے دور نے ہشیار کر دیا — ساغر ہے چرخ شربتِ دیدار یار کا

باریک موسے کوچۂ گیسو کی راہ ہے — اے شانہ، ہاتھ تھام دلِ بیقرار کا

حسرت یہ ہے کہ ہم تو اسیرِ قفس ہوئے — آزاد بوستاں میں ہے، موسم بہار کا

زیرِ قدم ہے، حشر میں آنکھ اس شہید کی — مارا ہوا ہے، کس نگہِ شرم سار کا

قمری ادھر کو آئے تو پھانسی گلے میں ہو — شمشاد نام ہے مرے گلشن میں دار کا

خونِ شہیدِ ناز سے، ٹپکیں وہ لذتیں — کوثر ہے تشنہ لب ترے خنجر کی دھار کا

خوں، بختیِ سخن نے کیا ہے، اٹھائے کون؟ — لاشہ، ہماری آرزوئے سنگ سار کا

کیوں ہے صراط ادھر سے اُدھر تک کھنچی ہوئی — محشر یہ تار ہے نگہِ انتظار کا

لپٹی گلے سے تیغ تو سودا فرو ہوا — یہ جونک خون چوس گئی جسمِ زار کا

گرمی سے ابرِ دودِ جگر کی بچا لیا — تھا شامیانہ عرصۂ روزِ شمار کا

عاشق مزاج ہیں، کہیں حوروں پہ مر نہ جائیں — جنت میں بھی رہے کوئی گوشہ مزار کا

کیوں صبح و شام وصلِ شفق گوں ہے آفتاب — اس طشت میں لہو ہے تمنائے یار کا

لائی گھسیٹ کر ترے در سے شہید کو — دامن لہو لہان ہے روزِ شمار کا

تھا صرف روئے شاہدِ رحمت پہ ایک خال　　دیکھا تو وہ گناہ ہے بژدہ ہزار کا

محشر میں کیا بیاں کو خطر یا ابو تراب
ذرّہ ہے آفتاب تری رہ گذار کا

(لسان الملک، میرٹھ: ستمبر، اکتوبر ۱۸۹۸ء)

﴿۴﴾

کھٹکا نہیں دل کی بستگی کا　　انجام ہے پھول، ہر کلی کا
ایک آنکھ سے سامنا کسی کا　　اللہ رے دیدہ آرسی کا
جلتا ہے شباب مفلسی کا　　یوں جیسے چراغ چاندنی کا
تیروں کو مزا ہے دل لگی کا　　اک شور ہے دل میں گدگدی کا
کیوں دور کھنچے ہے چرخ انجم　　سارا ہے طفیل آدمی کا
زخمی ترے لوٹتے ہیں کیا خوب　　محفل میں ہے فرش چاندنی کا
اس کوچہ سے لے چلے ملک کیوں　　یاں دخل نہیں ہے اوپری کا
جیتے ہیں بتوں کے مرنے والے　　حسن اک چشمہ ہے زندگی کا
یاروں نے کرید کر مری خاک　　پتلا دیا داب بیکسی کا
مانگا جو نمک کہا کہ بھولا　　او کور نمک مزا چھری کا
یوں دوڑتی ہے بدن میں بجلی　　رگ رگ میں اثر ہے اس ہنسی کا
تاریک ہے آبِ خضر یعنی　　کالا منھ ایسی زندگی کا
محشر میں بجائے کشتۂ ناز　　اک شور اٹھا چھری چھری کا

جب تک نہ ہو چار سو کی تنخواہ
کیا لطف بیاں ہے شاعری کا

﴿۵﴾

فلک نے ابر مرے سینہ کا بخار کیا　　مجھے مجھی پہ ستمگر نے اشکبار کیا

ہر ایک ذرہ نے ایجاد صد بہار کیا
یہ میری خاک کو کس گُل نے رہگذار کیا

بلا ہے شوقِ شہادت، نہ اُس نے وار کیا
جگر کو آپ ہی بڑھ کر سناں کے پار کیا

میں خوش ہوں وعدۂ فردا پہ، کون شخص ہوں میں
وہ شوخ اور یہ عمر اس پہ اعتبار کیا

کچھ ایسی چیز نہ تھے، دو جہان کیا ہوتے
دکھا کے آئینہ تم پر، تمھیں نثار کیا

زمیں میں زلزلہ ہے، آسماں میں تہلکہ ہے
کسی نے آج کسی دل کو بے قرار کیا

یہ آبلے نہیں، نکلی ہے آنکھ ہر مُو پر
ترا تو میرے سراپا نے انتظار کیا

مذاقِ عشق تو دیکھو کہ دل ہی دل نکلے
جو چاک سینہ مرا صورتِ انار کیا

دیا نہ تجھ کو دہن، بات ایک رکھی تھی
میں بدگماں کہ تجھے کس کا راز دار کیا

ہنوز سنگ میں آئینہ ہے، خوشا فرہاد
کہ بعدِ مرگ بھی شیریں کا انتظار کیا

طریقِ عشق میں کی بے خودی سے طے منزل
یہ تھی وہ رہ کہ نہ اپنا بھی اعتبار کیا

کہ کیوں ہو عاشق و معشوق کا جہاں دشمن
کہ حسن و عشق نے اچھوں کو بے قرار کیا

اُدھر وہ جلوہ کہ موسیٰ کو بے حواس رکھا
اِدھر یہ جذبہ کہ یوسف کو بے دیار کیا

سروں پہ داورِ محشر نے فرش کیں آنکھیں
تمھارے آنے کا کیا کیا نہ انتظار کیا

بیاں مرا دلِ خونیں وہ قطرہ ہے جس کو
محیطِ اعظمِ غمہائے روزگار کیا



نعش پہ شادی کے سبب رو گیا
داغ دل کے خون کا بھی دھو گیا

حشر میں کہتے ہیں کہ جھوٹا تھا عشق
مرقدِ تاریک میں کیوں سو گیا

خارِ مژہ پاؤں میں چبھنے لگے
کانٹے مرے حق میں وہ کیوں بو گیا

عشق نے کیا پھونک دیا اے بیاں
عقلِ مہذّب کو جنوں ہو گیا

﴿۷﴾

کس کو شوقِ جلوہ آرائی ہوا — مردمِ ہر دیدہ، موسائی ہوا

طاق سے آئینہ غش کھا کر گرا — کون محوِ جلوہ آرائی ہوا

بن گیا آئینہ پس کر سنگِ طور — کون محوِ جلوہ آرائی ہوا

حضرتِ آدم گرے، موسیٰ گرے — کس کو شوقِ جلوہ آرائی ہوا

منھ کی کھائی آفتاب صبح نے — کون گرم جلوہ آرائی ہوا

دیکھ کر اس رشکِ گل کا حسنِ سبز — لالہ کوئی سبزہ صحرائی ہوا

حسرتِ شداد ہے اک اک امنگ — کس کے در کا میں تمنائی ہوا

مجھ کو شیشہ نے کیا ہے سنگ سا — جور زیرِ چرخ مینائی ہوا

تو نے شیشہ میں اتارا اک جہاں — کون اسیر چرخ مینائی ہوا

اس دوتا سے کس طرح بنتی کہ میں — بندۂ اندازِ یکتائی ہوا

حسن سے ثابت ہے نسبت عشق کی — وہ تمنا، میں تمنائی ہوا

دم لبِ جاں بخش کا بھرتا ہے دل — اک مسلماں آج عیسائی ہوا

دور پھینک آئینہ، او خانہ خراب — باعثِ صد گونہ رسوائی ہوا

چشم تھی مدت سے بیمارِ جمال — اک سرِ گیسو بھی سودائی ہوا

ہو کے زندہ اے بیاں تجھ سے سخن
قائلِ اعجاز گویائی ہوا

﴿۸﴾

خدنگ اور پھر اُس شوخ کی نظر کا سا — جگر کسی کا نہ ہوگا، مرے جگر کا سا

اُڑا ہے رنگ کسی نا امید کا شبِ ہجر — کہ سوئے چرخ اُجالا ہے کچھ سحر کا سا

ستم کہ رشک، ترے گھر کو، لے چلا سر سے — گماں جو نقشِ قدم پر ہے، راہبر کا سا

ہوا میں آگ ترے سنگ در سے اٹھتی ہے — مرا وجود تپِ غم سے تھا شرر کا سا

شب وصال میسر ہوئی، مگر نہ ہوئی / کہ تابِ حسن سے تھا وقت دو پہر کا سا
گلا فراق میں سو بار کاٹتے، لیکن / مزا چھری میں کہاں تھا، تری نظر کا سا

بیاں کو نیند، تری یاد میں نہیں آتی
علاج کرتے ہیں کیوں چارہ گر سحر کا سا

﴿۹﴾

دل کے سوا کہاں ہے مقر، تیرے تیر کا / اس صید سے نہیں ہے مفر، تیرے تیر کا
طعمہ تو ہو چکا ہے جگر تیرے تیر کا / اب کس معاش پر ہے گزر تیرے تیر کا
اترا جگر میں، زخم جگر سے نکل گیا / گھر تیرے تیر کا یہ، وہ در تیرے تیر کا
سینہ میں سوزِ عشق نے چھوڑا نہیں لہو / منھ، پیاس سے گیا ہے اتر تیرے تیر کا
اس صرصرِ فغاں سے لرزتا ہے دل مرا / برباد کر نہ دے کہیں گھر تیرے تیر کا
پیکاں جگر میں ٹوٹ گیا پھر چھری چلی / کاٹا ہے پہلے صید نے سر تیرے تیر کا
دیکھ اس کو ہو نہ اہلِ ہوس کی نظر گزر / ہے ناوکِ نظر سے گزر تیرے تیر کا
امید کی طرح یہیں رہ جائے ٹوٹ کر / دل سے نہ ہو کہیں کو سفر تیرے تیر کا
پروانہ دامنِ تپشِ دل نہ چھو سکے / پہنچے نہ میرے فن کو ہنر تیرے تیر کا
گزرا وہ دل سے آہ گئی نہ فلک کے پار / کم میرے تیر سے ہے اثر تیرے تیر کا
رہتا ہے مرغِ قبلہ نما رُو بقبلہ کیوں / گر دمبدم نہیں اسے ڈر تیرے تیر کا
مرہم دہانِ زخم پہ رکھتا ہے چارہ گر / کرتا ہے بند راہ گزر تیرے تیر کا
اللہ اکبر اس سے جہاں بچ سکے کہاں / پر اک قضا ہے، ایک قدر تیرے تیر کا
اے آسماں قلم سے عطارد ہے سرنگوں / جھکتا ہے میرے تیر سے سر تیرے تیر کا
اٹھنے دیا نہ ضعف نے اس کو بھی بے عصا / تکتا ہے رستہ، دردِ جگر، تیرے تیر کا
پیکاں کو مرغِ جاں نے نشیمن بنا لیا / لایا اڑا کے صید کو، پر تیرے تیر کا
دم تھا گلو سے آب و نمک تیری تیغ کا / پیکاں تھا دل سے شیر و شکر تیرے تیر کا

لپٹا رہے گلو سے گلو تیری تیغ کا　　　چمٹا رہے جگر سے جگر تیرے تیر کا

میں شہسوارِ ملکِ بیاں ہوں مرے حضور
جوہر کھلا برنگِ دِگر تیرے تیر کا

﴿۱۰﴾

سرِشوریدہ، پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا
کبھی گھر تھا بیاباں میں، کبھی گھر میں بیاباں تھا

ترے کشتے کو محشر، خواب آسائش کا ساماں تھا
کہ صور افسانہ گو تھا زلزلہ گہوارہ جنباں تھا

جسے سب نوح کے فرزند کہتے ہیں کہ طوفاں تھا
کسی جاندادۂ خاموش کا، اندوہِ پنہاں تھا

بلا سے چور کردو، چور کردو، شیشۂ دل کو
اسی میں قید حسرت تھی، اسی میں بند ارماں تھا

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع، بیمارِ محبت نے
کسی کا پردہ رکھنا تھا، کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا

اکیلے اے بتو! ہم بھی نہ سوئے کُنجِ مرقد میں
جو اِس پہلو میں حسرت تھی تو اُس پہلو میں ارماں تھا

گئے تھے روندنے دل کو لیے بیٹھے ہیں تلوؤں کو
فرورگ رگ میں نشتر تھے، نہاں نس نس میں پیکاں تھا

مری ہستی کی محشر میں کوئی تعبیر کیا کرتا
کسی زلفِ پریشاں کا، میں اک خوابِ پریشاں تھا

قیامت تک پس از مردن رہی اک ٹیس سی دل میں
وہ کہتے ہیں کہ پیکاں تھا، میں کہتا ہوں کہ ارماں تھا

حضورِ بلبلِ کلکِ بیاں کس طرح کھلتے منہ
کہ بوئے غنچہ ساں محجوبِ نطقِ ہر سخن واں تھا

﴿۱۱﴾

اک صفرِ انتخاب رہا مہر کیا رہا — دیوانِ حشر میں مرا مطلع بڑھا رہا

محشر میں ناتوان جنوں سے خفا رہا — اٹھ کر جہانِ تنگ سے کب تک پڑا رہا

زخمِ نہاں کو زخمِ نہاں کا مزا رہا — چوری سے اس نگہہ کی طرف دیکھتا رہا

اے چرخ خونِ فخر سلیماں روا رہا — شامی قصاصِ مور و ملخ پوچھتا رہا

میں دکھ کا دکھ ہنسی کی ہنسی ہوں ستمگرو — زخموں میں شور خندۂ دنداں نما رہا

تاخیرِ آمد آمدِ قاتل سے ہوں خجل — غافل کہاں رہا کہ خدا دل میں آ رہا

کھینچا لہو سے ہاتھ کہ کیا احتیاج رنگ — دل خون پیش دستیِ برگِ حنا رہا

گھبرا کے کہتے ہو میں بگولے میں آ گیا — میرا غبار آپ پہ ناحق فدا رہا

تم ایسے گھر کو چھوڑ کے جاتے ہو کس کے گھر — یہ دل وہ ہے کہ جس میں خود آ کر خدا رہا

مجھ کو بھی جمع کر مری خاطر بھی جمع کر — پاشیدۂ کشاکشِ بیم و رجا رہا

زاہد کو اس نگہہ نے حرم میں دیا نہ چین — بیچارہ تنگ آ کے کلیسا میں جا رہا

اس کوچہ میں سیاستِ درباں کا کیا گلہ — آدم ستم رسیدۂ زخمِ عصا رہا

طرزِ طرازِ کاخِ مصور کو دیکھ کر — یوسف کو سادہ لوحیِ دل کا گلا رہا

دل ہو گیا شکار کہ غمزہ کمیں میں تھا — میں غافلِ تغافلِ چشمِ حیا رہا

سچ ہے کچھ اعتبار نہیں خوئے تند کا — خنجر وصال میں بھی کمر سے لگا رہا

اس کوچہ سے ہم ایسے نکالے گئے کہ بس — رو پیٹ کر بہشت میں آدم پھر آ رہا

فرعوں غریقِ آب، سکندر طرید آب — بس کوئی بدرقہ نہ کوئی رہنما رہا

کس کبر پا سے یار نے رکھا زمیں پہ پاؤں — محشر گلو بریدۂ اندازِ پا رہا

خوں سے معانقہ تو حنا سے مصافحہ — قاتل کی انجمن میں سماں عید کا رہا

خشت بنائے خانہ دل عشق تھا بیاں
روز اک نہ ایک، فتنۂ محشر بپا رہا

﴿۱۲﴾

طوق لپٹا ہوا گردن سے رہا — غم گلو گیر لڑکپن سے رہا
ہاتھ جب آ گیا پیروں چلنا — نہ خدا ہاتھ یہ دامن سے رہا
دیکھتا خضر رہِ عشق کی راہ — منتشر شیخ و برہمن سے رہا
نہ کیا زمرۂ احباب نے شاد — پر میں ناشاد نشیمن سے رہا
خاموشی میری زباں اور رہی — رنگِ دلکش گلِ سوسن سے رہا
تھے خط و خالِ حسیناں مرغوب — دانہ کش ماہ کے خرمن سے رہا

کسی کمزور سے تن کر نہ چلا
اور نہ دب کر کسی ہم فن سے رہا

﴿۱۳﴾

وہ ہوا بیمار واں، اور یاں میں اچھا ہو گیا — لو عدو کے درد سے میرا مداوا ہو گیا
گریہ سے تنگیِ دل کا راز افشا ہو گیا — اشک آتے ہی مری آنکھوں میں دریا ہو گیا
جاں فزا اس چشمِ شہلا کا اشارا ہو گیا — آپ کا بیمار بھی، رشکِ مسیحا ہو گیا
قتل ہم سے سخت جانوں کو کیا اک ہاتھ میں — اب تو تیری تیغ کا یہ کچھ بھروسا ہو گیا
صدمۂ آزار گویا، مژدۂ آرام تھا — دل دو پارہ کیا ہوا ہے، تیغ زن وا ہو گیا
مجھ میں اور تم میں اگر دیکھو تو اتنا فرق ہے — تم عدو کے ہو گئے اور میں تمھارا ہو گیا
تم عدو کے گھر گئے اور ہم خدا کے گھر گئے — وعدہ واں پورا ہوا یاں وعدہ پورا ہو گیا

سوزشِ دل نے بیاں کو مار ہی ڈالا غرض
آج اپنی آگ میں، جل بھن کے، ٹھنڈا ہو گیا

﴿۱۴﴾

اشکِ خونیں کبھی تھمنے نہ دیا
کبھی رنگ اور کا جمنے نہ دیا

آسماں مرکبِ دوری کی طرح
دودِ فریاد نے تھمنے نہ دیا

نہ کیا ثبت، غمِ دل جب تک
خوں، رگِ جانِ قلم نے نہ دیا

کس سے اس غبن کی لوں موجودات
کہ حساب اہلِ عدم نے نہ دیا

رہ گئے منزلِ مقصود سے ہم
راستہ دیر و حرم نے نہ دیا

نگہہِ یاس سے پوچھ، اے قاتل!
کام کیوں تیغِ ستم نے نہ دیا

زیست ہے موت کی تمہید، مسیح
دم کسی آپ کے دم نے نہ دیا

شیخ نے سوئے حرم شدھ باندھی
بوسہ جب سنگِ صنم نے نہ دیا

لوگ شادی سے ڈراتے تھے مجھے
چھوڑ طفلی میں بھی غم نے نہ دیا

خشک ہونے ، یہ مرا دامنِ تر
نمی ابرِ کرم نے نہ دیا

کیا زبردست پہ احسان بیاں
دل کبھی آپ سے ہم نے نہ دیا

﴿۱۵﴾

خود ہے نیاز و ناز کو لپکا نمود کا
پیشانیوں پہ داغ ہے، تیرے سجود کا

تھی خلق کیا کہ واہمہ خلّاق تھا مرا
دیکھا تو رنگ ایک ہے بود و نبود کا

بیتابیٔ گناہ میں، طاعت سے ہوں معاف
مضطر کو کیا خیال، قیام و قعود کا

تیرے مخالفوں کو تو صحت بھی ہے مرض
یعنی کہ رنگ زرد نشاں ہے یہود کا

دوزخ نہیں کچھ اور سہی، ہم کو کیا ہراس
جب تفرقہ رہا نہ زیاں کا نہ سود کا

مہرِ علی سفینۂ طوفانِ نوح ہے
ہر ذرہ اس طریق میں جودی ہے جود کا

مت پوچھ مستیٔ دلِ کافر کا ماجرا
میخواریوں میں، رنگ ہے شربُ الیہود کا

گونالہ کے شریک رہے لاکھ جزوِ تن
خاکا اڑا کیا مری خاکِ وجود کا

اے مرغ، پاؤں دیکھ کے رکھنا زمین پر — پھیلا ہوا ہے دام، رسوم و قیود کا
جوشِ کرم سے چشمِ عنایت نے رو دیا — اللہ رے گداز مرے دل کے دود کا
کس طرح اس کی دھوم سے احیائے دیں نہ ہو — مژدہ دیا مسیح نے جس کے ورود کا

آتش چھپی ہوئی ہے نیستاں میں، اے بیاں!
سرمایۂ حسد ہی، عدو ہے حسود کا

﴿۱۶﴾

کھلا ہے جلوۂ پنہاں سے از بس چاک وحشت کا
میں ڈرتا ہوں کہیں پردہ نہ پھٹ جائے حقیقت کا
کہاں لے جائے گا یارب سمندِ تند وحشت کا
کہ پیچھے رہ گیا کوسوں دو راہہ نار و جنت کا
غبارِ رنگ پرّاں ہے پھریرا تیری رایت کا
شکستِ قلبِ عاشق غلغلہ ہے تیری نصرت کا
کیا ہے قصد کس کے کنگرِ ایوانِ رفعت کا
کہ تھاما ہے ترے نالے نے پایہ عرشِ ہمت کا
جھکا دی قدسیوں نے بے تکلف گردنِ طاعت
زہے رتبہ کفِ خاکِ درِ والائے دولت کا
کھلے کس طرح پردہ، پردۂ گوشِ تحیّر پر
کہ بے صوت وصدا ہے پردہ سازِ بزمِ وحدت کا
صنم طاقِ حرم سے دفعتاً نیچے اتر آئے
ادب تھا بس کہ واجب دوست کے قاصد کے طلعت کا
حجابِ تن کسادِ رونقِ کالائے یوسف ہے
تردد کیا ہے زنداں خانۂ ہجراں سے ہجرت کا

سلاطیں کو نہیں پاتا مزاج ان کے فقیروں کا
کہ عنقائے فلک پرواز ہے قافِ قناعت کا
لبِ اصنام ہیں قندِ سخن سے سربمہر اب تک
خموشی سے مزہ پوچھے کوئی تیری فصاحت کا
مزے ملتے ہیں کیا کیا عشق کے لذت شناسوں کو
ہمیں دامانِ زخمِ دل، عوض ہے خوانِ نعمت کا
ترے حیرت کدہ میں فرش ہے آئینہ کیا اوبت
کہ خاصانِ درِ دولت کو ہی کھٹکا ہے ذلت کا
نگہہ بے حس، خطِ ساغر کی صورت ہے کہ ساقی نے
دیا ہے مردمِ چشمِ جہاں کو جام حیرت کا
تلاش جلوۂ معنی میں ٹکرایا کئے سجدے
نہ ٹوٹا دستِ خشک زہد سے بت خانہ صورت کا
قیامت برہمی ڈالی تو ہجراں کی گھڑی گزری
زمیں ہے گردشیشہ، آسماں شیشہ ہے ساعت کا
بتوں پر لات ماری مہرومہہ سے پھیرلیں آنکھیں
بیاں اللہ رے غمزہ مرے حسنِ عقیدت کا

﴿۱۷﴾

یار پہلو میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
تارِ گیسو، رگِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
دل میں وہ غنچہ دہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلِ شگوفہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
وہ ہی نورِ دوجہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
وہی یاں تھا، وہی واں تھا مجھے معلوم نہ تھا
دل مرا کعبۂ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
نالہ گلبانگِ اذاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
آنکھ پر ڈال دیا دیر و حرم کا پردہ
وہی دونوں میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

صفتِ نورِ بصارت وہ مرا پردہ نشیں — میرے پردہ سے عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
حسنِ صورت نے دیا، جلوۂ معنی کا پتہ — بت نہ تھا سنگِ نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
جانبِ کعبۂ مقصود تنِ زار مرا — روشِ ریگِ رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا

بے خبر پڑھنے لگا مومن و غالب کا کلام
کنجِ خلوت میں بیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

﴿۱۸﴾

آلودۂ طلب، ارنی گوئے طور تھا — برق، ایک تازیانۂ حسنِ غیور تھا
تکیہ عصا پہ دستِ توکل سے دور تھا — موسیٰ کو اوجِ طور سے گرنا ضرور تھا
آنکھوں میں جلوہ ریز یہ کس بت کا نور تھا — ڈھیلا ہماری آنکھ کا ہر سنگ طور تھا
اک ایک گام ضعف سے تھا منزلوں کی راہ — اے شوخ ناتواں بھی ترا کتنی دور تھا
فطرت کے سادہ دل کو نہ آتی تھیں فطرتیں — اے عقلِ فیلسوف یہ تیرا قصور تھا
سنتا تھا متصل رگِ گردن سے مثلِ تیغ — غیرت کو سر سے قطعِ تعلق ضرور تھا
اس میکدہ کا عیش بقدرِ شکست ہے — اتنا گھلا ہوا تھا میں جتنا کہ چور تھا
خجلت سے بے گناہ کی تھی مے عرق عرق — ذکرِ لبِ پیالۂ مَے یا غفور تھا
تھا حرفِ آرزو غلط العام کا فریب — ناداں طلسم خوردۂ لوحِ شعور تھا
چسکا غضب تھا شوق کا بجھتی تھی جتنی پیاس — اتنا ہی تشنہ کام، دلِ ناصبور تھا
نالے لگے ہوئے تری ٹھوکر سے کیوں نہ ہوں — تیرے قدم میں حشر مرے لب میں صور تھا
آتے ہی حسرتوں میں قیامت بپا ہوئی — سینہ میں شورِ **بُعِثِرَ مَافِي الْقُبُوْر** تھا
ہلتے ہی ابرو اُن کے گیا ٹوٹ پھوٹ دل — شیشہ کی طرح طاق سے گرتے ہی چور تھا

میں جس کو دیکھتا تھا دکھاتا نہ تھا بیاں
آنکھوں میں غیب تھا مرے لب پر حضور تھا

﴿۱۹﴾

کلیم، اوجِ محمد کا ہم عناں کیسا
یہاں ہے خرقِ فلک، بحر بیکراں کیسا

جہاں ہیں ہم، کوئی واں اس کی سرکشی دیکھے
جھکا ہوا ہے ترے در پہ آسماں کیسا

اُچھل کے میرے لہو نے پکڑ لیا دامن
نکل چلا تھا دمِ تیغ، خوں چکاں کیسا

پیاس بجھتی ہے خنجر سے، معجزہ تو نہیں
تمھارے ہاتھ میں ہے، چشمۂ رواں کیسا

بلند پائنچہ، پاشوخ، نازنیں گردن
گیا ہے خون شہیدوں کا رائگاں کیسا

دھوئیں جہاں کے اڑائے ہیں تیرے غمزہ نے
یہ تیرگی کچھ اسی کی ہے آسماں کیسا

ہنسی سے بھی وہ لبِ نازنیں ہوئے مجروح
ہوا ہے خون نزاکت کا رنگِ پاں کیسا

دلوں میں جانتے ہیں، گو زباں سے کہتے نہیں
کہ اس زمانے میں استاد ہے بیاں کیسا

﴿۲۰﴾

ان کا مُجملۂ اربابِ وفا ہوجانا
میرے نزدیک ہے بندہ کا خدا ہوجانا

رہ گیا تشنۂ دیدار کی تمثال حباب
تھا مجھے آنکھ کے کُھلتے ہی فنا ہوجانا

قلب ماہیتِ اشیاء ہے بتاثیرِ فشار
درد کو چاہیے، پہلو میں دوا ہوجانا

ہمتِ قطرۂ شبنم ہے، عرق ریزِ جبیں
کہ بیک پرتوۂ مہر فنا ہوجانا

جادۂ راہ ہے شبنم کے لیے تارِ شعاع
چاہیے حسن طلب، راہ گرا ہوجانا

آب زن، قطرۂ شبنم ہے، بداغفلتِ ہوش
پھر تقاضا کہ ذرا جلوہ نما ہوجانا

برقِ شوخی سے، نہفتہ وہ پری زاد ہوا
باور آیا مجھے شعلے کا ہوا ہوجانا

نقشِ بے ربط سمجھ، صورتِ خطِ توام
صفحۂ ہستیِ عالم کا جدا ہوجانا

سطرِ تعلیمِ تمنا ہے، ترا بندِ قبا
چاہیے شوق میں ہر عقدہ کا وا ہوجانا

تھا جو در پردہ بیاں زخمہ زنِ تارِ نفس
مجھ کو ہر پردہ میں تھا پردہ سرا ہوجانا

﴿۲۱﴾

کب ہوا وصل اس ستمگر کا
کب مرے سر سے آسماں سر کا

جس جگہ پر جلیں فرشتوں کے
کیا گزر ہو مرے کبوتر کا

دیر کیوں کی ہے، شور محشر کیا
منتظر ہے کسی کی ٹھوکر کا

وحشتِ شوقِ کوئے یار تو دیکھ
میں ہی رہبر ہوں، اپنے رہبر کا

تیرے جلوے سے گل زمیں میں سمائے
چمن اک فرش ہے مشجر کا

تا کہ اڑ جائے نامہ کی تحریر
خامہ کافر کے پاس ہے پر کا

آرزو جو ہوئی شہید ہوئی
میرے سینہ میں دم ہے خنجر کا

اے بیاں چل بہ کوریِ مہ و مہر
عرش ہے آستاں پیمبر کا

﴿۲۲﴾

اے جنوں ہاتھ کے چلتے ہی مچل جاؤں گا
میں گریباں سے پہلے ہی نکل جاؤں گا

وہ ہٹے آنکھ کے آگے سے تو بس صورتِ عکس
میں بھی اس آئینہ خانہ سے نکل جاؤں گا

مہر تم، سوختہ میں، شیشۂ آتش ہے رقیب
اس پہ ڈالو گے تجلی تو میں جل جاؤں گا

مجھ سے کہتا ہے مرا دودِ جگر، صورتِ شمع
دل میں روکو گے تو میں سر سے نکل جاؤں گا

شمع ساں برسرِ محفل، نہ جلا دیکھ مجھے
پھیل جاؤں گا ستمگر جو پگھل جاؤں گا

ٹھہرا اے مہر ذرا صبحِ شبِ وصل ہے آج
بام پر دھوپ چڑھے گی تو میں ڈھل جاؤں گا

روکتا ہوں کبھی شوخی سے تو ہر طفلِ سرشک
رو کے کہتا ہے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

کارِ امروز بفردا مگذار اے واعظ
آج اس کوچہ میں ہوں خلد میں کل جاؤں گا

کون اٹھائے گا الٰہی شبِ غم کی افتاد
منہ کو آتا ہے کلیجہ کہ نکل جاؤں گا

لیکے آنکھوں میں ترا جلوہ کہاں جائے گا
غیر کو دیکھ کے میں آنکھ بدل جاؤں گا

ہر طرح ہاتھ میں ہوں گوشۂ دامن کی طرح
وہ سنبھالیں گے جو مجھ کو تو سنبھل جاؤں گا

اٹھ کے دامن وہ اٹھائیں گے، تو جائینگے کہاں — خون کہتا ہے کہ میں اور اچھل جاؤں گا

اے بیاں سنئے ذرا ناصحِ ناداں کی ذٹل
میں بھلا آپ کی باتوں سے بہل جاؤں گا

(جلوۂ یار، میرٹھ: فروری ۱۹۱۴ء)

﴿۲۳﴾

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا — پھر اس شوخ کو اک نظر دیکھ لینا
سرِ زلف پھر کھول کر دیکھ لینا — ذرا پہلے سوئے کمر دیکھ لینا
مرے رشکِ خورشید کے ہو مقابل — ذرا دن کو حسنِ قمر دیکھ لینا
یہ ہے شامِ فرقت، یہ ہے شامِ فرقت — نہ ہوگی، نہ ہوگی سحر دیکھ لینا
لگایا تھا ہم نے شجر آرزو کا — نہ قسمت میں تھا یہ ثمر دیکھ لینا
وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنا تعلق — اِدھر دیکھ کر، پھر اُدھر دیکھ لینا
کہیں تیرے کشتے نہیں دبنے والے — زمیں کے تلے داب کر دیکھ لینا
دلِ تنگ میں حسرتوں کا لہو ہے — ذرا اپنے تیروں کے پر دیکھ لینا
کرو ذبح میں صیدِ بے بال و پر ہوں — اڑے گی نہ اصلاً خبر دیکھ لینا
جو سوٹھیکیاں لے کے آئی ہے لب تک — اسی آہ کا تم اثر دیکھ لینا
گیا ہاتھ سے، دل کو کیا پوچھتے ہو — کسی دن ہتھیلی پہ سر دیکھ لینا
رہا حسنِ رخ دیکھ کر دنگ صانع — کہ ہے اسمیہ آئینہ گر دیکھ لینا
رسائی ہے جنت، جدائی ہے دوزخ — کسی خوبصورت پہ مر دیکھ لینا

جو ہو جیتے جی خواہشِ سیرِ جنت
بیاں کوئے خیر البشرؐ دیکھ لینا

﴿۲۴﴾

تھک کے لیٹا تھا لحد میں شورِ محشر لے چلا — بارِ ہستی رکھ دیا تھا پھر اٹھا کر لے چلا

تھامنا اے ضبط، شوقِ کوئے دلبر لے چلا
پھر کوئی مجھ کو مرے قابو سے باہر لے چلا

شیخ کے ماتھے پہ مٹی برہمن کے بر میں بت
آدمی دیر و حرم سے خاک پتھر لے چلا

خوں تری گردن پہ ہے، آنسو مری آنکھوں میں ہے
تو صراحی لے چلا بھر کر، میں ساغر لے چلا

اے بیاں از بس کہ تھی شورِ محبت سے بھری
اس غزل کو میں سوئے دیوانِ محشر لے چلا

﴿۲۵﴾

چراغِ حسن ہے روشن کسی کا
ہمارا خون ہے روغن کسی کا

ابھی نادان ہیں محشر کے فتنے
رہیں تھامے ہوئے دامن کسی کا

دل آیا ہے، قیامت ہے، مرا دل
اٹھے تعظیم دے جوبن کسی کا

یہ محشر اور یہ محشر کے فتنے
کسی کی شوخیاں بچپن کسی کا

ادائیں تا ابد بکھری پڑی ہیں
ازل میں پھٹ پڑا جوبن کسی کا

کیا تلوار نے گھونگٹ مرے بعد
نہ منہ دیکھے گی یہ دلہن کسی کا

ہماری خاک محشر تک اُڑی ہے
نہ ہاتھ آیا مگر دامن کسی کا

بجائے گل مری تربت پہ ہوں خار
کہ الجھے گوشۂ دامن کسی کا

بیاں برقِ بلا، چتون کسی کی
دلِ پُر آرزو، خرمن کسی کا

(جلوۂ یار، میرٹھ: مارچ، اپریل، ۱۹۱۴ء)

﴿۲۶﴾

صرفِ فشار کینہ کنارِ بتاں ہے اب
میرے لیے تمام زمیں آسماں ہے اب

ذکرِ خدا بجائے خیالِ بتاں ہے اب
ہوتی ہمارے کعبۂ دل میں اذاں ہے اب

ظالم کو میری آہ نے دنیا سے کھو دیا
کہتے ہیں منتہائے نظر آسماں ہے اب

آج ان کو دیکھنا ہے تماشائے جاں دہی
بادِ صبا بتا مری مٹی کہاں ہے اب

قائل یہاں نہیں کوئی ان کے وجود کا　　　میں ہوں جہاں عدم میں وہی آسماں ہے اب

اس بت کے دل میں گردِ کدورت تھی اے بیاں
برباد کر گئی مجھے، ظالم کہاں ہے اب

﴿۲۷﴾

دلِ آرزو مندیٔ جاں عبث　　　سرِ مایۂ دست گرداں عبث
غبار اس کے دامن کا ہم سے نہ رکھ　　　جنوں دست رس تا گریباں عبث
صدا شور وحشت میں آتی نہیں　　　نصیحت کی باتیں ہیں ناداں عبث
ہوا کوئی اے گل نہ پُرسانِ حال　　　کیا چاک تو نے گریباں عبث
نہیں سامنے مصحفِ روئے یار　　　کیا حفظ زاہد نے قرآں عبث
دمِ واپسیں ہے دمِ انبساط　　　نہ ہو صورتِ صبح، خنداں عبث
مری پتلیاں پھر گئیں وقتِ نزع　　　عبث چشمِ امید انساں عبث
حسیں ہیں اگر فعل خلق حکیم　　　نہیں کوئی بھی پیرِ ناداں عبث
یہ سالوس کھل جائے گا عندلیب　　　نشاطِ فریبِ گلستاں عبث

تری طرز تحریر سے کھل گیا
بیاں شیوۂ مصطفیٰ خاں عبث

﴿۲۸﴾

اے چرخ سر پٹک کہ میں ناگہہ مرا ہوں آج　　　اے خاک، خاک اڑا کہ میں تجھ میں ملا ہوں آج
آ اے وفا، لباس مرے غم میں کر سیاہ　　　اک در پہ بے گناہ، میں مارا گیا ہوں آج
اے شورِ نالہ اٹھ کے اجل کو صدا تو دے　　　میں دم سے اپنے دم سے زیادہ خفا ہوں آج
دامن چھڑا کے کون مرے ہاتھ سے گیا　　　اے یاس کیوں میں چار طرف دیکھتا ہوں آج
کھایا ہے تیشہ میں نے بھی مانندِ کوہکن　　　تا صبح میں اپنے خون میں ڈوبا ہوا ہوں آج
سینہ میں مر نہ جائے کہیں سہم سہم کر　　　اے آرزو سدھار کہ دم توڑتا ہوں آج

قاروں صفت زمیں پہ سنبھلتا نہیں کہیں — اللہ اس نظر سے میں کتنا گرا ہوں آج

روتا ہوں لحہ لحہ تڑپتا ہوں دم بدم
کچھ اے بیاں نہ پوچھ میں کیا جانے کیا ہوں آج

﴿۲۹﴾

جہاں میں لوں نہ مزے کس طرح جناں کیطرح — کہ تیرا نام لبوں پہ ہے نوشِ جاں کیطرح

رہوں نہ گوشۂ عزلت میں کیوں زباں کیطرح — کہ مجھ پہ تنگ ہے عالم ترے دہاں کیطرح

گئیں جگر سے نگاہیں گزر، سناں کیطرح — تڑپ تڑپ گئے ارمان، نیم جاں کیطرح

خدنگ بن کے چبھی گُھب گئی سناں کیطرح — یہ تیکھی وضع، یہ ترچھی نظر، یہ بانکی طرح

اُڑا جو شورِ قیامت مری فغاں کیطرح — تو پہلے کانوں میں دیں انگلیاں اذاں کیطرح

نظر سے گو ہوئے رو پوش تم دہاں کیطرح — چھپے گا خوں نہ شہیدوں کا رنگِ پاں کیطرح

روانہ اشک رواں ہوں جو کارواں کیطرح — فغاں کے شعلے اڑے پرچمِ نشاں کیطرح

وہی اٹھائے مجھے جو بنے مرا مزدور — تمھارے کوچہ میں بیٹھا ہوں میں مکاں کیطرح

پڑے وہ راہِ محبت میں روز کے خطرے — کہ طے ہوا ہے ہر اک ہفت خواں کیطرح

حیات پر مہہِ نو تیغ تیز رکھتا ہے — فلک کو حرکتِ دوری ہے یاں فساں کیطرح

مکیں نہیں ترے بن کوئی کعبۂ دل میں — گواہی دیتے ہیں نالے مرے اذاں کیطرح

نہ کیوں فغاں ترا دم شکلِ نے بھرے جاؤں — کہ یاد ہے مجھے طفلی سے تو اذاں کیطرح

عروج دیکھیے شوریدگانِ الفت کا — مکاں میں رہتے ہیں وحشی یہ لامکاں کیطرح

پس از فنا غمِ عشق اے خدا کہاں رکھوں — زمیں کہیں نہ ابھر جائے آسماں کیطرح

وہ میرے غیرتِ خورشید کی تجلی ہے — کہ پارہ پارہ ہوا ہے قمر کتاں کیطرح

ہے کس کا نقشِ قدم آفتاب ذرہ نواز — کہ راستے ہوئے پُر نور، کہکشاں کیطرح

حکایتِ غمِ دل، داستانِ داغِ جگر — چلو سنائیں گلستاں و بوستاں کیطرح

گرا تھا حضرتِ یوسف کی طرح چاہ میں دل — نکال خط نے لیا آ کے کارواں کیطرح

ہوائے وحشتِ دل لے اڑی کہاں سے کہاں پڑی ہے دور زمیں گردِ کارواں کیطرح
چبھے گا دل میں ہر اک تار، تیر بن بن کر کہ زلف دوش پہ ہے چلّۂ کماں کیطرح
دبا دیا ہے یہ کس بے قرارِ الفت کو زمیں بھی اب متحرک ہے آسماں کیطرح
گئی تھی روح یہ کس غنچہ لب کی حسرت میں کلی کلی میں چھپی بوئے بوستاں کیطرح

اسی کو حق نے دیا ہے طرح طرح کا کمال
وہ طرح دے گئے شاعر یہ تھی بیاں کیطرح

﴿۳۰﴾

ہو جس طرح شراب سے، جامِ شراب سرخ پرتو سے اس کے رخ کے، ہوئی ہے نقاب سرخ
مضموں رقم ہیں عارضِ رنگینِ یار کے کیوں کر نہ مثلِ دفترِ گل ہو کتاب سرخ
آتے ہیں اشکِ خوں، جگرِ داغدار سے اس پھول سے کشیدہ ہوا ہے گلاب سرخ
نیرنگیاں فلک کی جبھی ہیں کہ ہوں بہم کالی گھٹا، سفید پیالے، شراب سرخ
اٹھی نہ جھونک سرمۂ دنبالہ دار کی آنکھ اس کی نازکی سے ہوئی بے شراب سرخ

رحمت سے اس کی صورتِ شام و شفق بیاں
ہو نامۂ سیاہ بروزِ حساب سرخ

﴿۳۱﴾

نہ کمر ملتی ہے قاتل کی، دہن کا نہ پتہ لیے پھرتے ہیں گواہوں کے کمن کا کاغذ
کشتۂ عشق ہے، کیا جانے کہے کیا منہ سے دیکھ کر کہہ دو فرشتوں سے کفن کا کاغذ
شوخیِ چشم کی تحریر ہے منظور نظر پوست کھچوا کے بناتے ہیں ہرن کا کاغذ
بن گیا گیسوئے مشکیں کی ثنا لکھنے سے میرے دیواں کا ورق مشکِ ختن کا کاغذ
گر پڑے ٹوٹ کے انجم کی طرح طفلِ سرشک دیکھ کر وادیِ غربت میں وطن کا کاغذ
اس کی فریاد قیامت میں لیے جاتا ہوں دوست بنوائیں کفن میرے بدن کا کاغذ
دمِ تحریر رہے پاسِ نزاکت اُن کا رگِ گل کا ہو قلم، برگِ سمن کا کاغذ

خطِ رخسار سے میں رہنِ غمِ عشق ہوا
ہوگیا اب مرے کاشانۂ تن کا کاغذ

چھن گیا ذکرِ مژہ سے تو کہا محشر میں
خوردۂ کرِم ہے رودادِ کہن کا کاغذ

لکھ دیا تھا جو کہیں صرصرِ فریاد کا حال
کاغذِ باد ہوا رنج و محن کا کاغذ

نیزۂ کلک سے خورشیدِ قیامت کا ورق
بن گیا صاف ترے سوختہ تن کا کاغذ

اے بیاں سینہ کے زخموں کا بنالوں پھاہا
ملے غربت میں جو یارانِ وطن کا کاغذ

﴿۳۲﴾

یہ میں کہوں گا فلک پہ جا کر زمیں سے آیا ہوں تنگ آ کر
جو اے مسیحا تو ہے مسیحا تو کچھ مرے درد کی دوا کر

تمھارے جلوے غضب کے دیکھے تمھارے چھینٹے بلا کے پائے
لگا لگا دی بجھا بجھا کر بجھا بجھادی لگا لگا کر

ضدیں محبت سے ایسی آئیں خیال رکھا نہ اپنے گھر کا
بتوں نے کعبہ کو مفت ڈھایا کسی کے دل کو دکھا دکھا کر

وہ شوخ بے اعتبار کافر رہا نہ تنہا گیا نہ تنہا
جو درد اٹھا اٹھا کر تو دل کو بیٹھا بٹھا بٹھا کر

یہ زور حرمان ویاس کا ہے اثر کہاں کا مری فغاں کو
پٹک پٹک خاک پر دیا ہے فلک سے اونچا اٹھا اٹھا کر

گداز کرتے ہیں میرے دل کو وہ یوں بٹھاتے ہیں اپنا سکہ
جلی کٹی ہورہی ہے کیا کیا عدو سے مجھ کو سنا سنا کر

سنی کسی نے صدائے طوطی نہ حالتِ عندلیب دیکھی
جو کور تھی اس چمن میں نرگس تو گل بھی اے ہمصفیر تھا کر

کہیں نہ زلفوں سے کھل پڑا ہو مجھے ہے اندیشہ اپنے دل کا

کہ پرزے پرزے اڑا رہا تھا عدو کوئی شئے دکھا دکھا کر
وہ بت کہ دیں اس کو تو نہ گردے تولا کھ طوفاں اٹھا کے دھر دے
زبان پھر صاف قطع کر دے جو منہ سے نکلے خدا خدا کر
الٰہی ہنگامِ آمد آمد یہ کس قیامت خرام کا ہے
کھسک چلے صحنِ بوستاں سے تدرو و طاؤس دم دبا کر
فلک ہوا مہرباں پھرے دن شبِ وصال آ گئی تو اس نے
بہارِ لطف و کرم دکھا کر نقابِ شرم و حیا اٹھا کر
کبھی ہنسایا کبھی رُلایا کبھی رُلایا کبھی ہنسایا
جھجک جھجک کر سمٹ سمٹ کر لپٹ لپٹ کر دبا دبا کر
بیاں ہے وہ بادشاہِ اسریٰ کہ جس کی درگاہِ خسروی میں
دیا زمینِ ادب کو بوسہ فلک نے گردن جھکا جھکا کر

﴿۳۳﴾

نظر جو آیا نظیر اپنا تو آنکھیں آئینہ کو دکھا کر
کہا جھلک تجھ میں ہے دوئی کی ابھی ذرا اور دل صفا کر

دیت بھی بخشی، لہو بھی بخشا جھکا کے سر، آنکھ ڈبڈبا کر
کہا جب اس بت نے وقتِ رخصت معاف میرا کہا سنا کر

ادا کرے کون روزِ محشر مری شہادت پھرا سکے منہ پر
گواہیاں دے رہی ہیں جھوٹی وہ زلفیں قرآں اٹھا اٹھا کر

سنبھل سنبھل کر ٹھہر ٹھہر کر ہماری فریادِ فتنہ زا نے
تمھارے کوچہ میں لا بٹھایا ہزار محشر اٹھا اٹھا کر

میں کوستا تھا فلک کو یارو ستم ظریفی فغاں کی دیکھو
بنا دیے آسماں ہزاروں دل و جگر کا دھواں اڑا کر

یہ فیضِ پیرِ مغاں ہے زاہد کہ لٹ رہی ہے کھلے خزانے
تو اپنے کوثر کو رکھا چھوتی تو اپنی جنت کو رکھا اٹھا کر

قتیل کس کا شہید کس کا یہ کون تھے قُم کے کہنے والے
اٹھا دیا یار کی گلی سے مجھے مسیحا نے کیوں جلا کر

وہ شوخ مستِ خرام آیا کہ حشرِ دل تھام تھام آیا
بزور دو چار گام آیا گرا ہی آخر کو لڑکھڑا کر

تری شرارت کا رنگ ظالم اڑا کے لایا خدنگ شاید
کچھ ایسی کی گدگدی جگر میں کہ ہنس پڑے زخم کھل کھلا کر

وہ شعلہ انگیز اگر رواں ہو تو شعلہ کب اس کا ہمعناں ہو
جو صاعقہ کو دمِ خرامش گرا گرا دے تھکا تھکا کر

غضب کے جلوے ستم کے عشوے بلا کی ابرو قضا کی چتون
اسے جلادے اسے لٹادے اسے فدا کر اسے فنا کر

کہا جو اندوہِ جانفشانی تو ہنس کے بولا وہ یار جانی
ترا فسانہ تری کہانی سنے ہماری بلا بکا کر

نہ ہونگے قاتل نہ ہونگے ٹھنڈے یہ تیرے گھائل نہ ہونگے ٹھنڈے
کبھی یہ بسمل نہ ہونگے ٹھنڈے کہ تو نے مارا جلا جلا کر

جو جلد جانا ہو اس صنم تک تو راستہ لو حریمِ دل کا
پھر آؤ کعبہ کے جانے والو یہ راہ جاتی ہے پھیر کھا کر

بسیطِ لوحِ زمیں سراسر، ہے تختۂ مشقِ نازِ دلبر
بنائے لاکھوں مٹا مٹا کر، مٹائے لاکھوں بنا بنا کر

یہ قہرِ صیاد کیا ٹھکانا اجلِ گرفتوں کو کیوں ستانا
تو دے اسیروں کو آب و دانہ نہیں تو کر ذبح یار ہا کر

لہو کیا لاکھ خواہشوں کا ہلاک کیں سیکڑوں امیدیں
سناؤں کیا سرگذشتِ دل کی وہ مٹ گیا اک جہاں مٹا کر

چمک نظر آ رہی ہے مجھ کو جھلک نظر آ رہی ہے مجھ کو
کہ رات دن میرے روبرو ہیں وہ چاند سورج سے منہ چھپا کر

شہیدِ دستِ ادا رہے گی پسے گی پامال پا رہے گی
ہری بھری کب حنا رہیگی بھلا حسینوں سے رنگ لا کر

جواب کیا ہے بروزِ محشر "بِاَیِّ ذَنبٍ قَتَلْتَنِیْ" کا
کہ قتل کیں میں نے آرزوئیں ہزاروں زندہ دبا دبا کر

بیاں ہزاروں عذاب جھیلے بہت حسینوں میں کھیل کھیلے
بتوں سے برسوں رہے جھمیلے بس اب کوئی دن خدا خدا کر

﴿۳۴﴾

خاک کرتی ہے، برنگِ چرخ نیلی فام رقص
ہر دو عالم کو، ترا رکھتا ہے بے آرام رقص

دیکھیے پیری کا حال اور دیکھیے ریشِ سفید
شیخ صاحب نامناسب ہے یہ بے ہنگام رقص

ابلقِ چشمِ بتاں کی شوخیاں چکرا گئیں
آسماں پر مہر و مہہ کرتے ہیں صبح و شام رقص

ہو حقیقی یا مجازی عشق کی حالت نہ پوچھ
خانقہ میں ئے ہے اور میخانہ میں بدنام رقص

صومعہ میں وجہِ صد تحسیں ہوا صوفی کا حال
میکدہ میں آن کر کیوں ہو گیا بدنام رقص

نرگسِ مخمورِ جاناں ڈال دیتی گر نگاہ
مردمِ چشمِ بتاں کی طرح کرتا جام رقص

عاشقانِ ابروئے بت کی ہے طاعت اضطراب
تھی نمازِ اہلِ حرم جب تک نہ تھا اسلام رقص

گرد پھرتا ہوں جو اس بر کے تو واعظ کیا ہوا
طوف میں کرتا ہے تو بھی باندھ کر احرام رقص

بحر میں گرداب ہے اور دشت میں ہے گردباد
خشک و تر میں ہے تری شوخی سے اے گلفام رقص

شوخ نے برہم نظامِ محفلِ امکاں کیا　　خاک نے چھیڑا ہے گردوں نے لیا ہے تھام رقص
پائمالِ غم پسے جاتے ہیں سرمہ کی طرح　　لے اڑی کس کے قدم سے گردشِ ایام رقص
تیری شوخی سے تری رفتار سے اے رشکِ باغ　　چوکڑی بھولا ہرن، طاؤسِ گُل اندام رقص

عیش جاویداُن کو حاصل ہے جو ہیں تیری طرف
طائرِ قبلہ نما کرتا ہے صبح و شام رقص

﴿۳۵﴾

نگارِ دیوانِ حشر کیوں ہو نہ مطلعِ آفتاب عارض
کہ قرصِ خورشید روزِ محشر ہے نقطۂ انتخاب عارض
جہاں ہے مفتونِ تابِ عارض حیا ہے ممنونِ تاب عارض
کہ صورتِ آفتابِ محشر ہے تابِ عارض نقاب عارض
الٰہی اغیار دیو صورت نہ لائیں تابِ عتاب عارض
کتاں سے نکلے شعاعِ عارض کماں سے تیرِ شہاب عارض
نہ فیض صحبت ہو نور فطرت کہ چشم و گیسو نہ لائے ایماں
اسی قبیلہ میں گوکہ اتری کتاب فصل الخطاب عارض
رلائے گا مجھ کو اے منجم تصور اس کے رخِ مبیں کا
کہ گرم سیرِ بروجِ آبی ہوا ہے اب آفتاب عارض
ہوئی قیامت کھلی حقیقت کہاں فریبِ نظر کا عالم
اٹھے ہیں آنکھوں کے اب تو پردے اٹھادو تم بھی حجاب عارض
وہ داورِ عرصہ گاہِ خوبی ہر ایک آنکھوں میں تول لے گا
ہوا خدنگِ نظر ترازو صباحِ روزِ حساب عارض
چھڑایا اندوہ عاشقی سے وہ آیۂ حق ہے نسخۂ خط
کیا ہے منسوخ جس نے آکر صحیفۂ رخ کتاب عارض

سوادِ شامِ وصالِ جاناں صباحِ روزِ جزا ہے مجھ کو
کہ شعلۂ آفتابِ محشر ہے جلوۂ آفتابِ عارض

وہ اس کے اوپر ہے قطرہ افشاں یہ اس کے اوپر ہے سایہ افگن
بخارِ ارض ابرِ بوستاں ہے یہ دودِ دل ہے سحابِ عارض

وہی لگائے وہی بجھائے وہی ہے آتش وہی ہے پانی
جو تابِ عارض ہے آبِ عارض تو آبِ عارض ہے تابِ عارض

بیاں ہوا ہے خطاب اپنا بیاں ہوا لاجواب اپنا
جواب دے جائے گی طبیعت کہاں جواب الجواب عارض

﴿۳۶﴾

کی عرض میں نے دفترِ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ محض غلط سربسر غلط

کوزہ میں بند ہو کہیں دریا سنا نہیں
طوفان باندھتے ہیں سرِ چشمِ تر غلط

کتنا کٹھن ہے مرحلۂ انتقالِ روح
جاتے ہو ایک جنبشِ ابرو سے بر غلط

لو اپنی نیستی میں ہمیں بھی ملا لیا
کہتے ہو ان کے ہے نہ دہن نے کمر غلط

دل ہی نہیں بغل میں اگر ہے تو تنگ ہے
اتنے سے گھر میں سروِ سہی قد کا گھر غلط

جوشِ دروں سے بارشِ بارانِ ابر جھوٹ
نوکِ مژہ سے فصدِ رگِ ابرِ تر غلط

یوں سیرِ آفتاب میں آئے خلل چہ خوش
کہتے ہو شامِ ہجر وجودِ سحر غلط

چہرہ کہیں سے لال، نہ دامن کہیں سے تر
جاری رہا ہے آنکھ سے خوں رات بھر غلط

پھنکتے ہیں لب کہیں، نہ زباں پھانکتی ہے آگ
اڑتے ہیں آہِ نیم شبی سے شرر غلط

اول تو فرطِ ضعف سے ہلتا پہاڑ جھوٹ
اور پھر تپش سے ہلتے ہیں کوہ و کمر غلط

ابروئے خم کو جانتے ہو تیغِ تیز جھوٹ
نوکِ مژہ کو باندھتے ہو نیشتر غلط

کس کی طلب کہاں کا کبوتر کہاں کی یاد
تحریر شوق و شکوہ غلط، نامہ بر غلط

بازی گری جنوں کی محبت کے شعبدے
سر دوش سے اچھل کے گرے پاؤں پر غلط

لایا ہے رنگِ نشۂ مَے ہم کو دیکھ کر
کہتے ہیں اُف رے جوششِ خونِ جگر غلط

ناحق کسی کا خون کریں ہم کو کیا غرض
آلاتِ قتل ابرو و چشم و نظر غلط

کمسن سمجھ کے دیتے ہو کیا ہم کو دھمکیاں
تاثیرِ ضبط جھوٹ، دعائے سحر غلط

خون چکیدہ آپ کا رنگِ شفق، دروغ
رنگِ پریدہ آپ کا نورِ سحر غلط

ہم کس طرح صحیح و سلامت رہیں بیاں
اس شوخِ سرگیں کی نہ ہوگی نظر غلط

﴿۳۷﴾

کہتی ہے کس کا زبانِ حال سے افسانہ شمع
بن رہی ہے بزم میں کس طور کی پروانہ شمع

گر نہ ہوتا داغِ الفت تیرہ بختوں کا چراغ
لیکے مشعل ڈھونڈتی پھرتی مرا غم خانہ شمع

قبر عاشق کی چراغ و شمع سے روشن ہو کیا
ہو سرِ تربت مگر حسنِ رخِ جانانہ شمع

بند کر لیتی ہے زیرِ برقعِ فانوس آنکھ
تا نہ وقتِ صبح دیکھے صورتِ بیگانہ شمع

وہ حسیں تو ہے کہ معشوقوں کو تیرا عشق ہے
گل ہے تیرا بلبلِ شیدا، تری پروانہ شمع

سر جدا ہوگا کہ لازم ہے شہیدوں کا ادب
پاؤں رکھتی ہے سرِ تربت جو گستاخانہ شمع

تاجِ پُر زر صبح کو ہوگا، نہ چاندی کا علم
کوئی دم کی ہے یہ تیری شوکتِ شاہانہ شمع

زندگی بھر شعلہ رخساروں کا پروانہ رہا
کوئی تربت پر بیاں بعد از فنا لانا نہ شمع

﴿۳۸﴾

غمزۂ معشوق، مشتاقوں کو دکھلاتی ہے تیغ
صورتِ ابرو ہمارے سر چڑھی جاتی ہے تیغ

ہوتے ہیں قرباں شہادت میں گلے مل کر شہید
دوشِ قاتل پر ہلالِ عید بن جاتی ہے تیغ

پست خم کھائے ہوئے لب خشک دم ڈوبا ہوا
چلتے چلتے اب تو او ظالم تھکی جاتی ہے تیغ

بے گناہی کا برا ہو زخم بے لذت ہوئے
دستِ قاتل میں برنگِ بید تھراتی ہے تیغ

اس کی گردن پر مرا خوں اس کا احساں میرے سر
اس سے جھک جاتا ہوں میں اور مجھ سے جھک جاتی ہے تیغ

پار دریائے شہادت سے اتر جاتے ہیں سر
کشتیِ عشاق کی ملاح بن جاتی ہے تیغ

خونِ گرم آتا ہے جب پانی میں لہراتا ہوا
مثلِ ماہی خوف کے مارے اچھل جاتی ہے تیغ

ابروئے خوں خوار قاتل کا کوئی پرساں نہیں
اب نکلتی ہے کہیں تو قرق ہو جاتی ہے تیغ

کب بجھے اس طرح ہے شوقِ شہادت کی پیاس
زخم کے منہ میں زباں بن کر نکل آتی ہے تیغ

مرحبا جذبِ شہادت اس کا مغرب ہے گلو
آپ منزل پر ہلال آسا پہنچ جاتی ہے تیغ

تشنہ کا موگھاٹ سے اترے تو بیڑا پار ہے
چشمۂ کوثر چھلکتا ہے کہ لہراتی ہے تیغ

لڑتی ہے چھینٹے لب جو رنگ کیسا لال ہے
مار کر پانی میں غوطہ خوں میں نہلاتی ہے تیغ

زخمِ کاری نے کہیں منہ کھول کر کچھ کہہ دیا
کیا ہوا قبضہ سے باہر کیوں ہوئی جاتی ہے تیغ

جان سے عشاق جاتے ہیں گزر، کٹتے ہیں غیر
پل صراطِ امتحانِ عشق کہلاتی ہے تیغ

آفتابِ داغِ سودا کی حرارت دیکھ کر
چھاؤں میں دل تفتگانِ غم کو بٹھلاتی ہے تیغ

مدعی در پردہ کٹ کٹ جاتے ہیں شکلِ نیام
اے بیاں میری زبانِ تیز کہلاتی ہے تیغ

﴿۳۹﴾

گلگشت تنگ عشق ہیں گلزار کی طرف
پرزے اڑائے تو نہ اڑے یار کی طرف

آنکھیں لگی ہیں کوچۂ دلدار کی طرف
دو کھڑکیاں کھلی ہیں، درِ یار کی طرف

پایا نہ بار محفلِ جاناں میں، رہ گئے
حسرت سے دیکھتے در و دیوار کی طرف

طاری ہوئی یہ شمع پہ حیرت کہ رہ گئی
انگلی اٹھی ہوئی ترے رخسار کی طرف

مستوں نے ٹھوکریں بھی نہ کھائیں سوئے حرم
سجدے کیے تو خانۂ خمار کی طرف

حسن و جمال شانِ خدا ہے، پھرا ہے تو
اے شیخ پست مصحفِ رخسار کی طرف

دے داد کون گرم روِ راہِ عشق کی
سایہ بھی ہوگیا تری دیوار کی طرف

میت ہے قبلہ رو ترے صحرا نورد کی
لیکن قدم ہیں وادیِ پُر خار کی طرف

تو شعلہ رُو ہے سینۂ سوزاں سے آلپٹ
شعلہ کو میل ہے کرۂ نار کی طرف

دل شیشۂ شراب کا ٹوٹا جو محتسب — ساغر کی آنکھ رہ گئی میخوار کی طرف

دریائے موج زن ہے تری تیغِ آبدار — وہ غرق ہو گئی جو گئی دھار کی طرف

الٹی سمجھ تو دیکھیے مشتاقِ دید کی — کہتا ہے دیکھ طالبِ دیدار کی طرف

دیوانہ چل نہ دے کہ پری زاد چل دیا — رکھوں بغل میں ہاتھ دلِ زار کی طرف

الحق پکارنا تھا اناالحق سرا ہوا — لایا زیادہ گو کو ادب دار کی طرف

وہ رشکِ حور مجھ کو قیامت کے دن ملا — حق پھر گیا اخیر کو حقدار کی طرف

پھولا ہوا شفاعت و رحمت پہ ہوں بیاں
ہیں کیسے دو وکیل گنہگار کی طرف

﴿۴۰﴾

خوں بہانے کے ہیں ہزار طریق — رنگ لانے کے ہیں ہزار طریق

کعبہ و دیر پر نہیں موقوف — اس یگانے کے ہیں ہزار طریق

کوئی مذہب نہیں زمانے کا — اس پرانے کے ہیں ہزار طریق

عذرِ مستی و مے پرستی کیا — بھول جانے کے ہیں ہزار طریق

دلستانی کے سیکڑوں انداز — دل ستانے کے ہیں ہزار طریق

یاد میں، خواب میں، تصور میں — آ! کہ آنے کے ہیں ہزار طریق

دل لگی، دل دہی، دل آرامی — دل لبھانے کے ہیں ہزار طریق

دلِ مشبک ہوا تو فرمایا — آنے جانے کے ہیں ہزار طریق

کس طریقے سے ہو نباہ بیاں
کہ زمانے کے ہیں ہزار طریق

(لسان الملک، میرٹھ مئی ۱۸۹۳ء)

﴿۴۱﴾

ہوا کو بار کب ہوتا ہے اس کافر کے مسکن تک
الٰہی کیوں کہ پہنچے گی ہماری خاک دامن تک

نہ ہونا قتل ہونا ہے حریصِ آبِ خنجر کا
مرا خوں تیری گردن پر رہے گا میری گردن تک

رہی دونوں کی جی کی جی ہی میں ضعف و نزاکت سے
نہ پہنچا ہاتھ دامن تک نہ آئی تیغ گردن تک

ہوائے شوق کس انداز سے چلتا ہوا دیکھا
کہ لاکھوں ناز سے آتی ہے بجلی میرے خرمن تک

نبھائے گا الٰہی کون ہم سے سخت جانوں کو
کہ بارِ خاطرِ دامن ہوئی عیسیٰ کو سوزن تک

تر و خشک جہاں سے آشنائے سیلیِ غم ہیں
کبودی نیلوفری چھا رہی ہے روئے سوزن تک

مگر احباب کو رحم آئے خس کی ناتمامی پر
نہ پہنچائیں جو گلشن تک تو لیتے آئے گلخن تک

زمیں اس شہسوار ناز سے لبریز شوخی ہے
رواں ہیں مثلِ ماہِ نو نشانِ سمِ توسن تک

بیاں ہم شکر کرتے ہیں شکایت کا محل کیا ہے
کہ پہنچایا ہمارے راہبر نے ہم کو رہزن تک

﴿۴۲﴾

ہاں لگدکوب زمیں ہے، تو عناں ریز فلک
توسنِ ابلقِ ایام کی شوخی کب تک

پستیِ طالعِ قسمت نے دکھایا وہ حضیض
کہ مجھے گاؤ زمیں ہے صفتِ گاؤ فلک

جنبش افزائے قفس ہے، طپشِ مرغِ قفس
مجھ سے کس زلزلہ میں ہے زمانا بسمک

ساغرِ چرخ لبالب ہے مرے اشکوں سے
دہر میں آتی ہے برسات جو جاتا ہے چھلک

سوزش آمادہ ہے دل، شیشۂ آتش کیطرح
ماسوا کو میں جلادوں جو پڑے تیری جھلک

سرہ و ناسرہ کا تجربہ منظور ہے ہاں پردۂ شب سے نہ غافل ہو کہ ہے سنگ محک

خاک میں اس نے ملایا مجھے، اس نے جاں لی وائے مجھ پر کہ عدو تھے مرے انسان و ملک

مژدۂ سیرِ ارم دشنۂ جانِ شداد بوئے خوں آتی ہے اس باغ سے اے گل نہ مہک

ہم نفس پوچھ نہ اس بزم کی برہم زدگی

ریگ ہے جرم زمیں شیشۂ ساعت ہے فلک

(لسان الملک، میرٹھ: جنوری ۱۸۸۹ء)

﴿۴۳﴾

مثلِ حبابِ بحر نہ اتنا اچھل کے چل ہیں ساتھ ساتھ موجِ حوادث سنبھل کے چل

برگِ خزاں رسیدہ سے آتی تھی یہ صدا اس باغِ سبز پر کفِ افسوس مل کے چل

در پے نہنگِ مرگ ہے، در پیش چاہ گور مستی نہ کر، حواس میں آمت مچل کے چل

سوتے ہیں لوگ، تار ہیں کوچے، گزر ہے تنگ تاریک شب ہے ساتھ چراغِ عمل کے چل

اے تن پرست، جامۂ صورت کثیف ہے بزمِ حضورِ دوست میں کپڑے بدل کے چل

آتی ہے زیرِ خاک سے آواز ہر قدم افتادگانِ راہ کے سر مت کچل کے چل

کب تک کثافتوں میں رہے گا برنگ سرد آبِ رواں کی طرح نکل اور نکل کے چل

جوں شمع تجھ کو آتشِ غم سے گریز کیوں سر پر دھری ہے آگ قدم تک پگھل کے چل

جوں نخلِ شمع، برقِ تجلی گرے کہیں

داغوں سے، آبلوں سے، بیاں پھول پھل کے چل

﴿۴۴﴾

بے شرم و حیا، صورتِ دشمن تو نہیں ہم گر ہیں یہ نگاہیں، یہی چتون تو نہیں ہم

اٹھ جائے گا پردہ کی طرح چشم جہاں سے وہ شوخ ہوا صاعقہ افگن تو نہیں ہم

ڈھل کر صدفِ چشم سے کیوں آتے ہیں آنسو دامن نے کہا بحر کے دامن تو نہیں ہم

دلہائے بتاں کہتے ہیں تاثیرِ فغاں پر آتش سے پگھل جائیں کچھ آہن تو نہیں ہم

تن پھینک نہ دیں صورتِ پاپوش دمِ شوق
گستاخ روِ وادیِ ایمن تو نہیں ہم

کچھ لطف سے بھی دوست کے، دل خوش نہیں ہوتا
رہتا ہے یہی وہم کہ دشمن تو نہیں ہم

کہتے ہیں مرے دیدۂ بیدار، یہ حسرت
یارب کسی دیوار کے روزن تو نہیں ہم

کیوں آگ لگی جلوہ سے، ہر گوشۂ تن میں
اے وادیِ ایمن ترے دامن تو نہیں ہم

سر قطع بھی ہو گر، تو نہ روئیں صفتِ شمع
مردانِ رہِ عشق سے ہیں، زن تو نہیں ہم

کچھ بھی نہ ہوا دانۂ امید سے حاصل
بجلی سے خطر کیا ہمیں، خرمن تو نہیں ہم

کہتے ہیں غزالانِ حرم، چشمِ بتاں سے
آہو ہیں ترے، دیدۂ پُرفن تو نہیں ہم

در پردہ جلے جاتے ہیں کس پردہ نشیں پر
انساں ہیں، چراغ تہہِ دامن تو نہیں ہم

کیوں ضعف سے پامال بتاں ہیں، دمِ جولاں
خم گشتہ ہیں، نعلِ سمِ توسن تو نہیں ہم

پردہ کی ہے کچھ بات کہ یوں پنبہ دہاں ہیں
شیشہ کی طرح بزم میں الکن تو نہیں ہم

کہتے ہیں مرے دیدۂ غمناک برس کر
بھادوں تو نہیں ہم، کہیں ساون تو نہیں ہم

وحشت نے بیاں بعدِ خزاں سیر دکھائی
آئے جو فرشتے، تہہِ مدفن تو نہیں ہم

﴿۴۵﴾

صبح قیامت آئے گی، کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں، کھولے ہوئے قبا کہ یوں

گوہر نابسودہ کو، زلف میں مت دکھا کہ یوں
میری کمندِ شوق میں رات کے وقت آ کہ یوں

کیوں کہ جھکے نسیم سے، سوچے تھی نرگسِ چمن
دیکھ کے چشمِ ناز کو آنے لگی حیا کہ یوں

چاہتے تھے شہود میں، غیب کا رنگ دیکھنا
میری زخویشِ رفتگی، بن گئی رہنما کہ یوں

سہو تھی وضعِ خاستن، بسترِ عیشِ وصل سے
دیکھ کے ان کی شوخیاں، فتنہ ہوا بپا کہ یوں

دیدۂ اہلِ عشق ہے، نورِ نگاہ سے تہی
آئے وہ فرشِ ناز پر، چھوڑ کے کفش پا کہ یوں

میں نے کہا کنارِ ناز، چاہیے اس غمیں سے پُر
سن کے رقیبِ زشت کو، پاس بٹھالیا کہ یوں

شعلۂ رشکِ غیر سے، جل کے اٹھا نہ جائے تھا
دودِ چراغِ بزم نے، اٹھ کے بتا دیا کہ یوں

خونِ شہیدِ عشق وہ، کہتے تھے فاش کیسے ہو
رنگِ گل عذار سے، سرخ ہوئی ہوا کہ یوں

اس کفِ پا کے بوسہ کی، کب مجھے راہ یاد تھی
بدرقۂ طلب ہوئی، جرأت سنگ پا کہ یوں

رزق نہیں ہے بن تلاش، کہتی تھی تنگیِ معاش
گردشِ سنگ آسیا، دینے لگی صدا کہ یوں

اس کے خرامِ شوق سے، پس گئی خلق کس روش
مٹ گئی بادِ تند سے، صورت نقشِ پا کہ یوں

سعیِ طریقِ شوق سے، فتنہ کو آگہی نہیں
اس کی جلو میں دوڑے سے، سایہ برہنہ پا کہ یوں

شب کو نموئے رنگ سے، خندۂ گل کا ذکر تھا
نشو و نمائے حسن سے ٹکڑے ہوئی قبا کہ یوں

نرگسِ مہوشاں سے پوچھ، گردشِ آسماں سے پوچھ
سرمہ ہوئے وفا سرشت، کیا کہیں اے خدا کہ یوں

صانعِ گلشنِ ارم میں نے کہا کہ ہائے ہائے
در پہ اس انجمن سے دور، قتل مجھے کیا کہ یوں

میں نے کہا نسیم سے، چٹکے ہے غنچہ کس طرح
کنجِ دہانِ تنگ سے، بوسہ نے دی صدا کہ یوں

ریختہ رشکِ فارسی، اس سے نہ ہو سکا بیاں
محفلِ عرسِ میر میں، شعر مرے سنا کہ یوں

﴿۴۶﴾

چھپا لو نوکِ مژگاں گوشۂ زلفِ معنبر میں
بتو رخنہ نہ پڑ جائے کہیں، دینِ پیمبر میں

فسوں چشمِ سیہ میں، معجزہ لعلِ لب تر میں
جلا دیتے ہیں پل بھر میں، جِلا دیتے ہیں دم بھر میں

سبک ٹھہرے گی بیبا کانہ شوخی ٹھہریئے بر میں
رہا سیماب برسوں دیکھئے آئینہ کے گھر میں

نہ بھولے گا ہمیں ہنگامۂ شمشیر و خنجر میں
گرہ غمزہ نے دی ہے گوشۂ ابروئے دل بر میں

چلی بادِ نسیمِ صبحدم یا ہاتھ قاتل کا
شہیدِ ناز کو نیند آ گئی آغوشِ خنجر میں

کیا پاسِ ادب اعجاز نے حفظِ مراتب کا
لبِ پاکیزۂ عیسیٰ سے اترا تیری ٹھوکر میں

فرشتے رشک سے لائے کہاں سرمستِ الفت کو
گرا تھا کوئے دلبر میں اور اٹھا صحنِ محشر میں

غضب وارفتۂ شوقِ شہادت تھے ترے کشتے
کہ ڈوبے آبِ خنجر میں اور ابھرے حوضِ کوثر میں

نمازِ اضطرابِ عشق کے سجدے ہیں یہ زاہد
کہ سر کٹ کٹ کے گرتے ہیں خمِ محرابِ خنجر میں

اِدھر شوقِ شہادت ہے اُدھر جوشِ نزاکت ہے
ٹھہرائے ذوقِ کشتن جزر و مد ہے آبِ خنجر میں

گرا دے پائے وحشت پر نہ دستِ ناتوانی سے
غمِ گستاخ سے کہہ دو کہ دردِ یار ہے سر میں
شہیدانِ وفا میں بعد مردن جان پڑتی ہے
کہ کٹ کر حرف روشن ہوتے ہیں الفت کے دفتر میں
خدا جانے نگاہِ یاس سے کیا چوٹ کھائی ہے
پڑی دم توڑتی ہے، تیغ بسمل کے برابر میں
ترا کوچہ نہ تھا مہماں سرائے شہرِ الفت تھا
دل آتے، جی ٹھہرتے، سر اترتے تھے ترے گھر میں

بیاں دل کی صفا روپوش ہے گردِ کدورت سے
اس آئینہ کو بھی مدفوں سمجھ گورِ سکندر میں

﴿۴۷﴾

بیٹھے رہیں پردہ میں تعلق نہ اٹھائیں
گھر میں اگر آئیں نہ تو دل میں بھی نہ آئیں
کچھ خیر ہے، وحشت تو نہیں عشقِ عدو میں
پھر مجھ سے نہ کہنا کہ تری خاک اڑائیں
سیدھے گئے اس کوچہ میں ہم، تیر سے، لیکن
ڈرتے ہیں، کھڑے در پہ کہ سیدھی نہ سنائیں
خلوت کدۂ دوست ہے دیوانہ سراپا
پیدا ہو پری گر مری زنجیر ہلائیں
مرتے ہیں، ترے ناز و نزاکت سے، مصور
گر کھینچ بھی لیں تجھ کو، تو اپنے کو مٹائیں
کیا کیجے کہ واں عجز کئے بھی نہیں بنتی
ہو جائیں اگر خاک تو باتوں میں اڑائیں
گو ضعف سے بیخود ہوں پہ خوددار ہوں کتنا
ڈرتا ہوں کہ ہمراہ مجھے چھوڑ نہ جائیں
آتے ہیں مرے قتل کو کس بکھری ادا سے
ڈر ہے کہ اسی طرح قیامت میں نہ آئیں
بے ساختہ جھک جھک کے چلی آتی ہیں زلفیں
کس پیار سے لیتی ہیں ترے منھ کی بلائیں

ہم کیا ہیں، ہمیں کھینچ، مگر آپ کو مت کھینچ
پیاں ترے نازک ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں

﴿۴۸﴾

نفسِ شریر شبہ پہ ہے، کیفِ شباب میں
ساقی شراب تھی کہ ملی تھی شراب میں
غیر از حجاب کچھ نہیں رکھا حجاب میں
کچھ حسنِ شوخ، بند نہیں ہے نقاب میں
عقدے اُسی قدر دلِ خانہ خراب میں
ہیں جس قدر گرہ ترے بندِ نقاب میں

ہاں ہاں شکستِ توبہ کی آواز میکشو
سنتا ہے کون غلغلِ رعد و سحاب میں

وہ ہم سے بارِ عام میں دیکھا نہ جائیگا
تکرار کیوں ہے رویتِ محشر کے باب میں

ریشِ سفید شیخ سے بچنا کہ عنکبوت
رکھتی ہے دامِ مکر، دہن کے لعاب میں

اے شوخ آج کون ترا پردہ پوش ہے
لاؤں شبِ فراق کو روزِ حساب میں

دل میں کبھی، بغل میں کبھی، چشم میں کبھی
آوارہ شوخیوں نے کیا ہے حجاب میں

آخر سمندِ عمر نے کھائی سکندری
ہے چوبۂ سپہرِ کہن کی طناب میں

زاہد کی ریش پنجۂ شاہد میں کیوں نہ ہو
رنگِ حنائے گمشدہ پکڑا خضاب میں

تیرِ افگنِ مژہ کی صفائی تو دیکھنا
دل چھد گیا ہوا نہیں روزن نقاب میں

سمجھا سوادِ سنبل و سرخیِ گل ہمیں
آئی بہار گر ترے خط کے جواب میں

رکھی ہے توبہ حملۂ قاضی کے واسطے
تا کوئی بال آئے نہ جامِ شراب میں

جو جلوہ فیضِ عشق سے مفتِ نظر ہوا
گزرا نہ تھا خیال زلیخا کے خواب میں

بازی گرِ فلک کا تماشا فریب تھا
ٹھہرے ہیں طفلِ طبع جہانِ خراب میں

اپنا غبار کون قیامت میں لے گیا
گر شورِ حشر تھا نہ تمہاری رکاب میں

ہے مصحفِ مجید میں بھی احسن القصص
تحسینِ خوب رو ہے نصوصِ کتاب میں

اے شورِ زنگ ناقۂ لیلیٰ صدا تو دے
آوارہ قیس کی ہیں امیدیں سراب میں

گو اس غزل کی داد اسداللہ خاں نے دی
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

آج اے بیاں وہ پھول کھلا دے کہ دیدہ ور
لے جائیں دامنِ نظرِ انتخاب میں

﴿۴۹﴾

ہیں چرخ کس کے اشک کے قطرے سحاب میں
ہیں خاک کس کی، خاک کے ذرے سحاب میں

کیا شعبدہ تھا پردۂ شیب و شباب میں
ابرِ بہارِ زیست چھپا آفتاب میں

سچ مچ وہ شعلہ بن گئے کیفِ شراب میں
کافر نے اور آگ لگادی شباب میں

رہتا نہیں ہے آتشِ خاموش کا فروغ
کچھ منھ سے بولئے بھی تو جوشِ عتاب میں

محشر مرا غبار اٹھائے گر اے خدا
رکھ دامنِ جنابِ رسالت مآب میں

کہتی ہے صبح مہرِ قیامت کو دیکھ کر
ذرے تھے ایسے رہ گزرِ بوتراب میں

آئینہ لوٹتا ہے خطِ سبز کی بہار
کیا خضر کو فریب دیا ہے سراب میں

شوقِ سجود، داغِ جبینِ نیاز تھا
گستاخیاں ہوئیں ترے در کی جناب میں

پاداشِ ظلم دیکھئے دل زلف میں رہا
دل میں رہی تمھاری تمنا عذاب میں

سرمستِ عشق ہوں مری آغوش میں درآ
رکھتے ہیں ہوشیار خزینہ خراب میں

اعجازِ خاص ہے گہرِ نظم کا رواج
اے دل روانیاں نہیں موتی کی آب میں

بندِ قبا کھلا تو وہ غصہ سے چپ ہوئے
لو اور سدِ باب ہوا فتحِ باب میں

واعظ نہ توڑ ساغر و مینا خدا سے ڈر
کس کی شبیہ ہے فلک و آفتاب میں

رد کردۂ زمین و فلک بجلیاں کہاں
آہیں کسی غریب کی ہیں اضطراب میں

اے شیخ دورِ جام سے ریش اپنی دور رکھ
گلگونِ بادِ شعلہ رکھے ہے رکاب میں

شاگرد مرغ کلک ہے اس باز تیغ کا
تھا جس کا آشیانہ کفِ بوتراب میں

گر ہے غرورِ گرم روی آفتاب کو
اترے ہمارے وادیِ گم گشتہ آب میں

بھر بھر کے دولتِ کے و جمشید پھینک دی
ساقی گدائے خم نے کدوئے شراب میں

کیوں کر عدم میں فتنۂ محشر مچائے شور
ہے عاشقانِ یار کی تقدیر خواب میں

پہلو میں آگ، دل میں سناں، زخم میں نمک
کیا فرق تفتگانِ جنون و کباب میں

ہے ہے وہ دل کہ فرشِ تگاپوئے ناز میں
آتی ہے پا برہنہ قیامت رکاب میں

غیر از عطائے دوست نہیں مایۂ عباد
حیراں ہوں پھر محاسبہ ہے کس حساب میں

پشت و شکم، زمین و لحد، وادیِ جزا
مٹی رہی خراب جہانِ خراب میں

بے قسمتوں میں لوح میں کیا اور جزا میں کیا
مدِ فضول تھا میں حساب و کتاب میں

شوقِ شمارِ بوسۂ رخ داد خواہ ہے
یارب شبِ وصال ہے روزِ حساب میں

سوزِ جمالِ یار نے ایجادِ نو کیا
صبحِ ازل سے داغ نہ تھا آفتاب میں

کیوں کعبہ و کنشت میں سر پھوڑتے ہیں لوگ
سجدوں کی منتہیٰ ہے اسی کی جناب میں

ہمسر ہوئی تھی کس کے رخِ تابناک سے
آتش پڑی ہوئی ہے سقر کے عذاب میں

سر اس قدم پہ چرخ ستمگر نے رکھ دیا
یوسف نے یہ کرشمہ نہ دیکھا تھا خواب میں

گر ہم فنا ہوئے تو فنا ہے سپہر بھی
شکل ہوا مکیں ہیں، مکانِ حباب میں

دریائے ہفت گانۂ گردوں نہ دھو سکے
کیا داغ حسنِ رشک سے تھا ماہتاب میں

یکمشتِ خاکِ خم نے فلاطوں بنا دیا
ساقی ڈبو مجھے بھی سبوئے شراب میں

جورِ نگاہِ یار کی میزاں نہ دی گئی
اک مد ہوئی تمام نہ روز حساب میں

نالہ نے اُس جہان میں کیا جانے کیا کیا
آیا دھواں کہاں سے جہانِ خراب میں

مدہوش کردیا ترے غمزہ نے کس قدر
آدم گرے کہاں سے جہانِ خراب میں

اتنا لکھا ہے میں نے کہ بندہ ہوں آپ کا
تم دیکھنا وہ لکھتے ہیں کیا کیا جواب میں

نطقِ بیاں سے آج تفاوت عیاں ہوا
گلبانگِ عندلیب و نوائے غراب میں

﴿۵۰﴾

کیا تشہیر تعذیرِ تصور شامِ فرقت میں
کہ سر خورشید کا نیزے پہ لائیں ہیں قیامت میں

کوئی بسمل تڑپتا رہ گیا شوقِ شہادت میں
کہ ہر جا خون کے دھبّے ہیں دامانِ قیامت میں

ستم ڈھائے تھے کوتاہی نے اس کی شامِ فرقت میں
بجا ہے دیں اگر خورشید کو سولی قیامت میں

مجھے بھی نقدِ آمرزش کی محشر میں ضرورت ہے
شہنشاہا کمی کیا ہے تری سرکارِ رحمت میں

شرارآ سا جہاں سے اٹھ کے دے تعظیم اوکامل
خدا کی شان وہ خورشید رواس کنجِ ظلمت میں

تعصب سینہ سوزِ شیخ ہے پانی چھڑک ساقی
پھنکا جاتا ہے زہدِ خشک مذہب کی حرارت میں

اچھل کر بھی نہ پائی تیرے قامت کی سرافرازی
تماشا ہے کہ ہر فتنہ معلّق ہے قیامت میں

بیاں ایسی غزل لکھی ہے انعامِ الٰہی سے
ہے جس کی دھوم اک دل میں تو کیا ساتوں ولایت میں

بیاں ہر شعرِ تر، بحرِ سخن کا دُرِ یکتا ہے
نزاکت میں، لطافت میں، فصاحت میں، بلاغت میں

﴿۵۱﴾

روتی ہے شبنم کہ نیرنگ جہاں کچھ بھی نہیں
خندہ زن ہے گل کہ رنگ گلستاں کچھ بھی نہیں

جنکی نوبت کی صدا سے گونجتے تھے آسماں
دم بخود ہیں مقبروں میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

کل شئی هالك الّا وجه کا شور ہے
کائناتِ ہستیِ کون و مکاں کچھ بھی نہیں

ہاتھ ملتی ہے حنا روتی ہے شبنم سرنگوں
خام ہے رنگِ گل روئے بتاں کچھ بھی نہیں

پھر اِدھر سے پھر اُدھر کو منہ بشکل آفتاب
ہے وہاں سب کچھ ارے غافل یہاں کچھ بھی نہیں

خاک پر ٹوٹا پڑا ہے کاسۂ سر ہائے ہائے
دور میں اے جم ترا جام جہاں کچھ بھی نہیں

کیسا افسونِ تکلم کس کا اعجاز کلام
گر نہ ہو الطافِ یزدانی بیاں کچھ بھی نہیں

﴿۵۲﴾

گوہرِ مقصد ملے، گر چرخِ مینائی نہ ہو
غوطہ زن بحرِ حقیقت میں ہوں، گر کائی نہ ہو

خونِ مہندی، خاک سرمہ، دل مرا آئینہ ہو
اے خود آرا دربدر تیری خود آرائی نہ ہو

چھین کر زندوں سے اس نے بخش دی مردوں کو جان
اے مسیحا یہ قیامت ہے مسیحائی نہ ہو

تو رہے افسوس دشمن کے دلِ تاریک میں
ایسی کالی کوٹھری میں قید تنہائی نہ ہو

زلف، رخ کے گرد ہے، لو کفر مومن ہو گیا
لب، تہہِ رخ ہیں، کہیں اسلام عیسائی نہ ہو

اس نے کیا پھونکا کہ اسرافیلِ محشر جل گیا
نالۂ پُر سوز ہے یہ، تیری شہنائی نہ ہو

ساقیا سیری کہاں، رندِ دو عالم نوش کی
ظرفِ مینا گر بقدرِ چرخِ مینائی نہ ہو

چشمِ ظاہر بیں نے کی معشوق کی بے پردگی
پردہ پوشی کو کہیں موسیٰ غشی آئی نہ ہو

بزمِ دیدارِ قیامت گرم ہے بے آسماں
شمع اس فانوس سے باہر نکل آئی نہ ہو

عرصۂ محشر میں آتا ہوں مگر ہے ایک شرط
یا نہ ہو دیدار یا کوئی تماشائی نہ ہو

معصیت پردے میں کرتا تھا کہوں گا اے بیاں
ہوں ترا عاصی، مری محشر میں رسوائی نہ ہو

(لسان الملک، میرٹھ: جولائی ۱۸۹۸ء)

﴿۵۳﴾

نہ ڈھیلے کی طرح ٹھکرایئے اس نورِ گیہاں کو
کہ رکھا ہے خدا نے اے بتو آنکھوں میں انساں کو

چڑھی آنکھیں، چڑھے ابرو کہاں لیجاؤں ایماں کو
وہ دل کس کا حرم میں لوٹ لیں دینِ مسلماں کو

چھری حلقوم پر رکھیے، نکلنے دیجے ارماں کو
کہ قیدی چھوڑ دیتے ہیں مسلماں عیدِ قرباں کو

دلِ صد پارہ کیا اے شیخ سی اپنے گریباں کو
کہ اس غمزے کی شوخی نے کیا سیپارہ قراں کو

نہ ہو چبھتا ہوا بلبل تو کیا لطف اس کی الفت کا
بدل لے غنچۂ گل سے مرے قاتل کے پیکاں کو

نہ دیکھوں مہر کا منہ شامِ وصل اے مردمِ دیدہ
گریباں صبح کا، تارِ نگاہِ یاس سے ٹانکو

یہاں بھی سایہ رکھتے ہیں، وہاں بھی مہر رکھیے گا
ذرا پھیلایئے گا اور بھی رحمت کے داماں کو

گلوئے یاس پر چلتی ہوئی کچھ دم چراتی تھی
مگر شوخی سے غمزہ کھینچ لایا تیغِ برّاں کو

کیا ہے زور سے ٹکڑے، کیا ہے رقص سے بسمل
مرے نالے نے گردوں کو، تری ٹھوکر نے دوراں کو

کسی کا تم کو کیا کوئی نہیں، ہاں کوئی مر جائے
دیا کاندھا نہ اٹھ کر درد نے تابوتِ ارماں کو

انار دانۂ تر کی طرح، ذوقِ دلِ پُر خوں
خدنگِ یار کس پر چھوڑ کر جاتا ہے پیکاں کو

کیا پنہاں، کیا پیدا، کیا پیدا، کیا پنہاں
ترے پردے نے پیدا کو ترے پرتو نے پنہاں کو

بیاں فیضِ قلم سے تو نے جاں ڈالی فصاحت میں
سکھائے معجزے کس نے ترے کلکِ زباں داں کو

﴿۵۴﴾

اگر نالے اٹھا لیتے نہ سر پر چرخِ گرداں کو
تو گنجائش کہاں ملتی مرے غم ہائے پنہاں کو

غمِ دل دیکھ کر جوش آ گیا پھر چشمِ گریاں کو
جگہ اے نوح دینا اب کہیں کشتی میں طوفاں کو

رہائی کیوں نہ دی اٹھ کر اسیرِ شامِ ہجراں کو
اٹھا اے حشر نیزے پر سرِ خورشیدِ تاباں کو

صف روزِ جزا میں بھی کوئی پرساں نہیں یارب
رکھا ہے آج بھی فردا پہ کیا رودادِ ہجراں کو

چھپے گا خوں اسی پردے میں کیا اے داورِ محشر
لباسِ چشم پوشی چاہیے شمشیرِ عریاں کو

مٹایا آسماں کو میرے نالوں نے قیامت کی
نکلنے اب تو پاسِ یار دے اندوہِ پنہاں کو

رلایا اپنے ہنسنے پر، ہنسایا اپنے رونے پر
مرے ہنسنے نے بجلی کو ترے رونے نے باراں کو

شبِ فرقت گلے مل مل کے دونوں خون روتے تھے
ترا ارماں تھا حسرت کو تری حسرت تھی ارماں کو

وہ زلفیں کھول دیں، شاید مرے عقدے بھی کھل جائیں
انھیں پھندوں میں باندھا ہے گرے دل کو مری جاں کو

یہ کیا گردِ خرامِ یار سے آفت برستی تھی
کہ ہر فتنے نے سر پر رکھ لیا محشر کے ارماں کو

غضب کو دم، ادا کو دیں، نگہ کو دل، مژہ کو جاں
غنیمت بانٹتا ہے حسن، افواجِ ستمراں کو

کہاں کا عدل، کس کی داد، کیسا حشر او غمزے
الٹ دے دامنِ محشر پٹک دے مہرِ تاباں کو

وہ اٹھے، حشر اٹھا، فتنے اٹھے، رستخیز اٹھی
مگر اٹھنے نہیں دیتے مری خاکِ پُر ارماں کو

انار دانہ تر کی طرح ذوقِ دلِ پُر خوں
پھڑکتا ہے کہ ہر قطرے میں رکھ لوں نوکِ پیکاں کو

جوابِ خونِ ناحق کیا دیے محشر میں بڑھ بڑھ کے
کیا جادو بیاں لو اور بھی سرمے نے مژگاں کو

برا ہو رشکِ قاتل کا چلیں باہم گر چھریاں
کہ اٹھ کر ذبح کر ڈالا اس ارماں نے اس ارماں کو

ہوا محشر زمینِ اشک ہم سے چھوٹ گئے مردم
کہ پائیں نقب دیکر دولتِ دیدارِ جاناں کو

قیامت بھی ہے فریادی کہیں آشوبِ قامت کی
کہ لائی مہر کے پردے میں نیزہ پر گریباں کو

کلیدِ بابِ دولت ہیں مرے گردوں شکن نالے
طلسمِ آسماں ٹوٹے تو دیکھوں گنجِ پنہاں کو

اترتے ہیں بیاں عرشِ عروجِ فکر سے مضموں
کتابِ آسمانی جانتے ہیں میرے دیواں کو

﴿۵۵﴾

دیا دل کو، سویدائے نہاں کو
خیالِ خال کو، یادِ دہاں کو

تذروِ قلب کو کنجشک جاں کو
عقابِ تیر کو زاغِ کماں کو

سرِ والا کو حلقِ خوں چکاں کو
خمِ شمشیر کو اوجِ سناں کو

چراغ دیں کو قندیل رواں کو — شبِ گیسو کو برقِ ابرواں کو
ہزاروں دل کو قمری کی زباں کو — گلِ گویا کو شمشادِ رواں کو
زرِ ایماں کو دینارِ اماں کو — کفِ رہزن کو طرّارِ بتاں کو
غبارِ تن کو نعشِ رائیگاں کو — سوارِ ناز کو رخشِ جہاں کو
شکارِ روح کو صیدِ تواں کو — کمندِ زلف کو موئے میاں کو
عبادت کو عروجِ عزّ وشاں کو — غبارِ رہ کو رنگِ آستاں کو
نشانِ نام کو، نامِ نشاں کو — بتانِ ناز کو، نازِ بتاں کو

گلِ معنی کو، اکلیل بیاں کو
سرِ عرفی کو دستارِ بیاں کو

﴿۵۶﴾

بدلنے، رنگ، سکھلائے، جہاں کو — کہوں کیا سرمہ کو، وسمہ کو، پاں کو
دیا ہے دین و دل تاب و تواں کو — نگہہ کو، زلف کو، تل کو، دہاں کو
کیا پھیکا مرے رشکِ چمن نے — سمن کو، یاسمن کو، ارغواں کو
مرے خوں کے نشاں ہیں، دھو چک اے شرم — جبیں کو، آستیں کو، آسماں کو
خرام مہوشاں چکر میں لائے — زمانہ کو، زمیں کو، آسماں کو
طلسمِ صنعتِ بیچوں ہے، دیکھو — کفل کو، ساق کو، موئے میاں کو
لبِ نوشیں نے سکھلائی حلاوت — شکر کو، شہد کو، قندِ کلاں کو
کیا روپوش، شرمِ روئے بت نے — جناں کو چشمۂ حیواں کو جاں کو

کہاں ہیں اہلِ فن لاؤں کہاں سے
نظیری کو ظہوری کو بیاں کو

﴿۵۷﴾

گماں کیا کیا نہ آئے بدگماں کو — کہ بستر پر نہ پایا ناتواں کو

نہ چھوڑا اس صنم کے آستاں کو
بلندی بھی نہ سوجھی آسماں کو

میں لوں کیا دے کے اس جنسِ گراں کو
دیا بیعانہ میں دونوں جہاں کو

بیٹھایا ضعف نے شور و فغاں کو
پکارے کون مرگِ ناگہاں کو

کہاں آرام سے ملتی ہے روزی
قفس سے میں نہ بدلوں آشیاں کو

نکل جائیں نہ پیکاں ہائے قاتل
جراحاتِ دلِ بیتاب ٹانکو

رکیں سودے میں کیوں کر ہاتھ ناصح
نہ روکے ہوش میں جب تو زباں کو

وہ آئے باغ میں سکھلائے بلبل
کوئی فصد رگِ گل باغباں کو

ہے اس پردہ میں نورِ چشم یعقوب
نہ لینا ساتھ گردِ کارواں کو

کہوں کیا صدمۂ فرقت کا عالم
ق ہلایا عالم کون و مکاں کو

یہی ضد تھی دل و جاں کی، کہیں سے
دکھا دو جلوۂ حسنِ نہاں کو

وہیں دردِ طلب اٹھا اور اٹھ کر
اٹھایا خفتہ ہائے ناتواں کو

حرم میں آن پہنچے اور نہ پہنچے
غبار آہوے صحرائے جاں کو

میانِ سنگِ اسود دیکھتے کیا
فروغِ جلوۂ لعلِ گراں کو

کنشتِ برہمن میں آن ڈھونڈا
چراغِ خانماں سوزِ بتاں کو

کہا ناقوس، نے دیتے ہیں آواز
ازل سے اس بتِ نامہرباں کو

بتوں کی پتلیاں پتھرا گئی تھیں
زبس تکتی تھیں راہِ دلستاں کو

پڑا تھا دیر میں ہر سو اندھیرا
تجلی نے تسلی دی نہ جاں کو

کیا دیوانگی نے قصدِ گلگشت
کہ دیکھیں گل میں اس بوئے نہاں کو

نسیم آئی درِ گلشن سے دوڑی
کہ اے غافل نہ کھو عمرِ رواں کو

عبث مانگے ہے یکمشتِ گیا ہے
گل باغِ بہارِ صد جناں کو

کفِ خاشاک پکڑے کیوں کہ پکڑے
کنارِ دامنِ برقِ تپاں کو

کیا کوکو سے قمری نے کنایہ
چمن ڈھونڈے ہے اس سرو جناں کو

دکھائی غنچہ نے چٹکی کہ چٹکو تراکیا منھ کہ دیکھے بے دہاں کو

سراغِ نرگس میگوں کی دھن تھی ہم آئے جھومتے کوئے مغاں کو

دکھائی آنکھ ساغر نے کہ ہیں ہیں!! کہاں دیکھے ہے عکس دلستاں کو

اگر میخانہ ہوتا اس کا مسکن نہ رہتیں گردشیں رطلِ گراں کو

نہ دیکھا ان آتشیں شیشوں میں ناداں فروغ آفتابِ بے قراں کو

تڑپ آتش کدہ میں لے کے آئی لگی آگ، آتشِ شوقِ نہاں کو

کہا شعلہ نے جل کر ہاتھ مت پوچھ جہنم سے، بہارِ صد جناں کو

پکاری یاس خاکستر میں خورشید چلوائے دہر یو مت خاک پھانکو

بھنک آئی جو اس کے نام کی سی گئے مسجد میں سن، شور اذاں کو

تہی اس نیر اعظم سے پایا خم محراب کے برجِ کماں کو

نظر وہ مصحفِ خوبی نہ آیا ٹٹولا شیخ جی کے جزوداں کو

نہ کی تشریح اس موئے میاں کی سنا درسِ طبیب نکتہ داں کو

گئے دیوانگی میں سوئے مکتب کہ پوچھے فتنہ آموزِ جہاں کو

دبستاں میں دھرے تھے منحنی چند کئے وابستۂ بحث و بیاں کو

پھنسا تھا نقطہ و خط میں مہندس نہیں پہچانتا زلف و دہاں کو

طلسم وہم میں تھا فلسفی غرق کسی کم راہ گنج شائگاں کو

حکیم آوارہ کوسوں تھا کہ اس نے دلیل راہ سمجھا تھا گماں کو

نہ کی تکرار میں اوقات ضائع چلے گردان کر تاب و تواں کو

تمنا خانقہ کو لے کے دوڑی کہ پوچھے پیر سے اس نوجواں کو

نہ تھا اس گیسوؤں والی سے عارف ملاتے بال کے تھے ہاں میں ہاں کو

تہی تھا خیمۂ دستار زاہد عبث روکا قناعت طیلساں کو

نہ ہاتھ آیا پتہ اس لالہ رو کا سوئے دشت و جبل پھیرا عناں کو

ندادی روحِ قیس و کوہکن نے
کہاں کو اے طلسماتی کہاں کو

بھٹکتے پھرتے ہیں تجھ سے ہزاروں
وصالِ لیلیٰ شیریں زباں کو

نہ پہنچے تا سوادِ شہرِ محبوب
سفر ہے آج تک ریگِ رواں کو

دیا دریا نے بھی سوکھا جواب آہ
کہاں لے جاؤں شوقِ بیکراں کو

کہیں اس شعلہ کا مسکن نہ سوجھا
منگایا طور سے سنگِ نشاں کو

نہ دیکھا، مصر کی گزری بھی دیکھی
کسی دکاں میں اس جنسِ گراں کو

کہیں اس کا سرا پردہ نہ دیکھا
کیا نالے نے طے اس ہفت خواں کو

اڑے سوئے فضائے آسماں ہوش
لگا کر بال پروازِ فغاں کو

کئی جنگل دکھائے بیخودی نے
گزر جس میں نہ تھا وہم و گماں کو

پرے ادراک کی سرحد سے گزرا
جہاں سے راستہ تھا لامکاں کو

ہوا سے دور بے تابی نے پھینکا
دکھایا ہو بہو ہو کے مکاں کو

تحیر نے لپک کر باگ روکی
کہ بس بس فرسِ تند آگے نہ ہانکو

نہ اس عالم میں ہے سمع و بصر سے
سنا دیکھا نشانِ بے نشاں کو

جنونِ دل غرض کون و مکاں میں
لیے پھرتا تھا معنی رائیگاں کو

تلاشِ یار سے باقی نہ چھوڑا
زمیں کو آسماں کو کوہ و کاں کو

تر و خشک و در و دشت و پس و پیش
زمانِ کن مکانِ این و آں کو

نہیں ملتا نہیں ملتا کہیں وہ
کہاں سے لاؤں اس آرام جاں کو

بیاں کچھ نالہ سنجی اور کیجے
ابھی غرّہ ہے اربابِ فغاں کو

﴿۵۸﴾

زمیں سے کیا تعلق ہے زماں کو
ترے غمزے نے دے پٹکا جہاں کو

نہیں ہاتھ آگئی اس بدگماں کو
ازل میں کیوں ملایا ہاں میں ہاں کو

گنوانا دن کو ہے کھونا ہے جاں کو سمجھتے ہم نہیں سود و زیاں کو
چھڑکتا ہوں میں کوئی دلستاں کو بکھرنے دو نگاہِ خوں چکاں کو
جوابِ خوں دئے بڑھ بڑھ کے کیا کیا غضب ہے سرمہ، مژگاں کی زباں کو
تغافل اس قدر اے شحنۂ ناز چرا لے جاتے ہیں اغیار جاں کو
لرزتی ہے زمیں، ہلتے ہیں گردوں کوئی نکلا کسی کے امتحاں کو
نگاہِ گرم، شوخِ دلنشیں تھی وگرنہ آہ پھونکے اور جہاں کو
سنایا ایک دن کچھ حال اپنا کسی گوشہ میں اس ابرو کماں کو
کہ لے پہنچے فلک پر طبقۂ خاک نہ روکوں میں اگر اشکِ رواں کو
گرادے خاک پر چرخِ مقرنس نہ رکھوں بند اگر دل میں دخاں کو
یہ سن کر رحم ظالم کو نہ آیا کہا تو یہ کہا آزار جاں کو
خدا ان عاشقوں سے بھی بچائے ملاتے ہیں زمین و آسماں کو
فلک نے کچھ نہ چھوڑا کیوں نچوڑا فشارِ گور نے اس ناتواں کو
نہیں گیسو، لیا ہے گھیر شاید مرے وسواس نے اس دلستاں کو
کرشمہ بن گئی آنکھوں میں آکر نہ پایا گفتگو نے جب دہاں کو
کیا کیوں وارثوں نے دعویٔ خوں وہ چھپنے جاتے ہیں دشمن کے ہاں کو
خدا کو مجھ سے پوچھیں گے نکیرین نہ لانا قبر پر اس بدگماں کو

بیاں کے غلغلے کیا کیا نہ تھے آج
سنا اس طوطیٔ ہندوستاں کو

﴿۵۹﴾

میدانِ جلوہ ہے ترے حسن وضیا کے ہاتھ موسیٰ سے چھین لے ید بیضا بڑھا کے ہاتھ
دیکھو چرا لیا دلِ بسمل چرا کے ہاتھ باندھو حسین بند سے دزدِ حنا کے ہاتھ

رخ سے نقاب کس نے اٹھایا کہ قطع ہیں
یوسف کی انگلیاں، تو کلیمِ خدا کے ہاتھ

داروئے اہلِ دل لبِ جاں بخشِ یار ہے
عیسیٰ سے ہیں بلند مری التجا کے ہاتھ

جل جائے میری نبض کی تعریف سے کلیم
دیکھیں ذرا جناب مسیحا لگا کے ہاتھ

انگشتِ شمع تھام کے آیا ہے بزم میں
پروانہ کس نے کور کیا ہے دکھا کے ہاتھ

بجلی گری کلیم پہ اور طور پر کلیم
کیا کیا تماشے اس نے دکھائے دکھا کے ہاتھ

مٹھی میں بس کہ ہے دلِ آتش بجاں مرا
دستِ کلیم ہیں مرے یوسف لقا کے ہاتھ

کافور صبح گر نہ لگائے یہ لمعہ چیں
جل جائیں تابِ حسن سے مہر سما کے ہاتھ

دامن کشی ضرور ہے گردن کشی فضول
اوچھے ہیں خونِ ناخنِ اہلِ وفا کے ہاتھ

فتنے سنبھال لیتے ہیں دامانِ آستیں
چلتے ہیں قتل گہہ میں جو اس فتنہ زا کے ہاتھ

کف الخضیب یار سے ممکن قراں نہیں
کیا کیجیے اے ستارہ شناسو دکھا کے ہاتھ

میری زباں کے آگے کلام کلیم کیا
کب چل سکیں بیان کے آگے عصا کے ہاتھ

﴿۶۰﴾

ادادانِ فسوں کاری، خماریں چشم، قاتل ہے
زنخداں مکتبِ تعلیم، سحر چاہِ بابل ہے

شہادت منزلِ مقصود ہے، ملّاح قاتل ہے
یمِ موّاجِ بیتابی، دمِ شمشیر ساحل ہے

تگِ و تازِ سمندِ جسم تا ایوانِ قاتل ہے
اُتر کر لے اے سرِ شوریدہ اب نزدیک منزل ہے

جگر عارض کا شیدا ہے تو دل زلفوں پہ مائل ہے
شہیدِ بدروہ، یہ کشتۂ جنگِ سلاسل ہے

چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دیدارِ قاتل ہے

کسی کا سر ہتھیلی پہ کسی کے ہاتھ میں دل ہے
کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں اس کی مشکل ہے
یہاں پریوں کا جمگھٹ ہے وہاں حوروں کی محفل ہے
مرا دل لے کے شیشے کی طرح پتھر پہ دے پٹکا
میں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہے
ہزاروں دل مسل کر پیر سے جھنجھلا کے یوں بولے
لو پہچانو تمہارا ان دلوں میں کونسا دل ہے
فساد انگیزِ جسم و جاں، ہوا ہے دشت الفت کی
جنوں قیسِ بیاباں گرد کو فرہاد کی سل ہے
اگر پہنچے تو پہنچے گیسوؤں کا سلسلہ ہم تک
ازل سے پیش پا افتادہ مضمونِ سلاسل ہے
نگاہِ یاس نے کیا تاک کر چھریاں لگائی ہیں
لہو میں لوٹتی ہے تیغ، خنجر نیم لبل ہے
چلی ارض و سما پہ آتشِ تیغ دودم کس کی
کہ سینہ ماہ کا زخمی، گلو ماہی کا گھائل ہے
غمِ الفت گلو گیر نفس ہے پھیر دو خنجر
تمہیں آسان ہے مشکل، ہمیں آسان مشکل ہے
ازل سے اکتساب اندوزِ استادِ ازل ہوں میں
بیاں تائید سحاں ہو تو کیا سحبانِ وائل ہے

﴿۶۱﴾

سیہ روزی سے میری چرخ اسیر بند مشکل ہے
کہ طشتِ خور میں کا فورِ سحر کے پاس فلفل ہے

حجابِ قالبِ خاکی ہے جب تک دید مشکل ہے
مکانِ عاشق و معشوق میں دیوار حائل ہے

مزہ پھرتا ہے ہونٹوں سے تلاشِ خونِ بسمل ہے
زباں بگڑی ہوئی ہے کیا چٹوری تیغِ قاتل ہے

تڑپ جاتے ہیں اس کے خال ورخ کو دیکھنے والے
نہ کر دے نیم بسمل، کیوں کہ تل بھی نیم بسمل ہے

مری صورت ہے خود صورت سوالِ دید جاناں کی
ہیں کشکولِ گدا آنکھیں، تو مژگاں دستِ سائل ہے

نگاہِ یاس کی چھریوں نے لے چھوڑا قصاص اپنا
جو قاتل تھا وہ بسمل ہے، جو بسمل تھا وہ قاتل ہے

ستارے صورتِ پروانہ کس کے گرد پھرتے ہیں
الٰہی کون فانوسِ فلک میں شمعِ محفل ہے

مرا دل اے بیاں مجنوں ہے اس لیلیٰ شمائل کا
غبارِ عالمِ ایجاد جس کی گردِ محمل ہے

﴿۶۲﴾

کئے آنے میں اس نے بھی بہانے — کہ دیکھی تھی ادا تیری قضا نے
نہیں یہ آدمی کا کام واعظ — ہمارے بت تراشے ہیں خدا نے
نزاکت کو پسینہ آ نہ جائے — کسے باندھا ترے بندِ قبا نے
مرے مجموعۂ خاطر سے تو نے — کیا جو تیرے گیسو سے صبا نے
تم آئے دل میں یا جھونکا صبا کا — لگیں حسرت کی کلیاں مسکرانے
ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے — کئے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے
ہوا ہے خون کس کا شوقِ پابوس — چھپایا ہے جسے برگِ حنا نے

خموش اب تک نہ رہتا شورِ محشر　　لگادی مہر تیرے نقشِ پانے

چمن میں کون آتا ہے بیاں آج

کیا رقص و سرود آب و ہوا نے

﴿۶۳﴾

ترا کشتہ اٹھایا اقربا نے　　چلے محشر کو مٹی میں دبا نے

دبایا اس نے تن اور اس نے جاں لی　　کیا قسمت مجھے ارض و سما نے

بھلا اے داورِ محشر کہاں خواب　　کٹھن تھے میرے الفت کے فسانے

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھ کو　　کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

نگاہیں قہر میں ڈوبی ہوئی ہیں　　لگے تم زہر میں چھریاں بجھانے

تری بالیدگی سے تنگ ٹوٹا　　طلسمِ ناز باندھا تھا قبا نے

نفس گم اور سخن باقی رہے گا　　نہ ہوگا تار نے ہوں گے ترانے

زمیں ہے محضرِ خون شہیداں　　کہ مہریں کی ہیں تیرے نقشِ پانے

رگِ گل سے کمر باریک تر ہے　　لگے تم غنچے کی مٹھی میں آنے

گرا پردہ، گرے موسیٰ، گری برق　　یہ ہل چل ڈال دی تیری ادا نے

ترے چلنے سے سینہ میں زمیں کے　　اٹھا اک دردِ محشر کے بہانے

مسلّم ہے کہ دی ہر فن میں قدرت

بیاں کو قادرِ مطلق خدا نے

(لسان الملک، میرٹھ: ستمبر ۱۸۸۷ء)

﴿۶۴﴾

گرد پھرتے ہیں اس یگانے کے　　دور خود رفتہ ہیں زمانے کے

جن سے آشیپ حشر ڈرتا ہے　　ہیں وہ مردے ترے زمانے کے

بے ٹھکانوں کو ڈھونڈتا ہوں میں　　کہ پتے ہیں ترے ٹھکانے کے

ہم نے اس طرح جان دی ہے کہ وہ — اب کسی کو نہیں ستانے کے
دورِ سلطانی بادہ ہے بادل — ہیں پھریرے شراب خانے کے
خونِ ناحق حنا نہیں ہے تو — وہ نہیں تیرے ہاتھ آنے کے
دل کو کیا چیز چھین لیتی ہے — چیستاں ہے نہیں بتانے کے
واعظ و شیخ کو پکڑ لاؤ — چور ہیں یہ شراب خانے کے
توڑ دے نالہ آسماں دن کو — ہیں طلسمِ کہن خزانے کے
زلفِ شبگوں کے مبتلا اے حشر — دن کو قصہ نہیں سنانے کے
ہو چکے ہیں غنی امیروں سے — رہنے والے فقیر خانے کے
کر دیا بے خودی نے گھر خالی — سن کے مژدے تمھارے آنے کے
اب سراپا دہن ہیں صورتِ رم — شوق تھے تن پہ تیر کھانے کے
لے اڑی صید دل کو بے تابی — تھک گئے تیر اس نشانے کے
لو وہ اٹھے قدم، نقاب کے ساتھ — آگئے دن، قیامت آنے کے
وہ مہہِ نو کجا، کجا خورشید — ہم نہیں آشنا پُرانے کے
کہکشاں کون تھا یہ شاہسوار — ہیں نشاں کس کے تازیانے کے
میرے نالوں سے کانپتی ہے برق — منھ میں تنکے ہیں آشیانے کے
چھوڑ کونین صورتِ نعلین — اور حضوری طلب لگانے کے
اس کی ٹھوکر نے کر دیا پامال — آسماں سر نہیں اٹھانے کے
چھا گیا دودِ آہ محشر پر — رشک تھے دیکھنے دکھانے کے

اے بیاں بامِ عرش پر قدسی
منتظر ہیں ترے ترانے کے

﴿۶۵﴾

ڈھنگ، بے ڈھنگ ہیں زمانے کے — رنگ، بیرنگ ہیں زمانے کے

موئے مشکیں نے باندھ لیں مشکیں — یہی سرہنگ ہیں زمانے کے
اک نیا رنگ روز لاتے ہیں — آپ، ہمرنگ ہیں زمانے کے
منحصر کچھ نہیں ہے غنچوں پر — گل بھی دل تنگ ہیں زمانے کے
اے پری زاد تیرے دیوانے — اہلِ فرہنگ ہیں زمانے کے
اک سلیماں کا تخت کیا پرِ باد — جملہ اورنگ ہیں زمانے کے
واہ رے نقش، واہ رے نقاش — آئینے، دنگ ہیں زمانے کے
گردشِ آسماں فلاخن ہے — آدمی سنگ ہیں زمانے کے
صلح اب کس سے کیجیے، صلحا — بر سرِ جنگ ہیں زمانے کے
شوق دکھلائے وہ جہاں کہ جہاں — محو نیرنگ ہیں زمانے کے

ہے بیاں مانعِ ترقی کون
عذر سب لنگ ہیں زمانے کے

﴿۲۶﴾

فتنے اس فتنہ گر کے قامت کے — چلتے پرزے یہ ہیں قیامت کے
اوج اللہ رے تیرتے قامت کے — فتنے دب دب گئے قیامت کے
شعبدے کھل گئے قیامت کے — تھے یہ بہروپ تیرے قامت کے
نقشِ پا شوخ سرو قامت کے — یہی آثار ہیں قیامت کے
دیکھ کر ٹھاٹھ اس کے قامت کے — فتنے منکر ہوئے قیامت کے
جھونکے آتے ہیں بوئے الفت کے — پھول یارب ہیں کس کی تربت کے
لب نہ گویا ہوئے جراحت کے — کچھ مزے پوچھیے شہادت کے
بڑھ گئے ہاتھ اپنی وحشت کے — آج پردے پھٹے حقیقت کے
دی ہے مٹی کسی کے عاشق کو — رو کے اٹھے ہیں ابر رحمت کے
اس کے کوچے سے آتی ہے آواز — رن پڑیں گے یہاں شہادت کے

ہم نے دیکھے ہیں اس کے دو رخسار | اے خدا گے ہیں دن قیامت کے
جن کو کہتے ہو سات دوزخ تم | ہیں حرارے مری حرارت کے
بٹ گئے گور میں تردد سب | ہیں تو کوچے یہ ہیں ملامت کے
شور ہے دل میں غم کے نالوں کا | علم اٹھتے ہیں آج حسرت کے
لختِ دل طفل اشک اٹھائے ہیں | تعزیے ہیں شہید حسرت کے
تا عدم کوئی سلسلہ نہ گیا | رشتے اوچھے ہیں کیا محبت کے
وہ جو ویراں پڑے ہوئے ہیں دل | ہیں یہ اجڑے دیارِ الفت کے
تیری باتوں میں کیا حلاوت تھی | کہ نہ لب کھل سکے شکایت کے
مئے و شاہد کو جانتے ہیں، جنوں | بھولے بھالے یہ لوگ جنت کے
دل ہمارا محیطِ اعظم ہے | کاش ٹاپو نہ ہوں کدورت کے
ہم پہ اور تیغ ناز کھینچ نہ سکے | چوچلے ہیں تری نزاکت کے
گل و شمع و چراغ و شمس و قمر | ہیں یہ دھوکے تمہاری صورت کے
بیکسوں پر کوئی نہ لایا پھول | ہوگئے گل، چراغ تربت کے
قید جب عام و خاص کی نہ رہی | نہیں قائل ہم ایسی رویت کے
اے ریاکار سر پہ رکھ کر بھاگ | پاؤں ٹوٹے ہوئے قناعت کے
کیوں نہ مچلیں گناہ گاری پر | ننھے بچے ہیں تیری رحمت کے

اے بیاں قیس و وامق و فرہاد
تھے یہ سارے مرید حضرت کے

﴿٦٧﴾

گیا زیرِ فلک باغِ جناں سے | قفس میں مجھ کو لائے بوستاں سے
صبا اتنا تو کہنا باغباں سے | کہ کیا ضد تھی ہمارے آشیاں سے
کہے آوارگی ریگِ رواں سے | کہ جاتی ہے کہاں آئی کہاں سے

کجی اچھی، اگر ہو راستی خیز
یہ نکتہ تیر نے سیکھا کماں سے

مری آبادیاں، بربادیاں ہیں
کہ سیکھا تنکے چننا آشیاں سے

رہا دل کے ہر اک رخنہ میں پیکاں
یہ کمبخت آرزو نکلے کہاں سے

فروغ فکر دکھلا دے بیاں اور
کہ مہر اترا زمیں پر آسماں سے

﴿۶۸﴾

چلی ہیں آرزوئیں ساتھ یاں سے
جہاں لے کر چلا ہوں میں جہاں سے

چھڑائے ہم نے قیدی آسماں سے
کہ توڑا گنبدِ گردوں فغاں سے

شہید اور ہمسرِ خورشیدِ محشر
ہمارا سر ہو بالا ترسناں سے

فراتِ عشق تھا خنجر تمھارا
نہ پایا بوند بھر پانی بھی یاں سے

سناؤں سوزِ دل کیا، صورتِ شمع
دھواں اٹھنے لگا نوکِ زباں سے

چلو تارِ نفس پر صورتِ برق
نہ بحث اے عنکبوت اس ناتواں سے

نہیں اب مقبرے شہرِ خموشاں
کہ مردے چیخ چیخ اٹھے فغاں سے

ترقی سے تنزل اے قیامت
سر آبِ تن نہ اترے گا سناں سے

ملی ہے خاکساروں کو بلندی
غبارے لے گئے فوق آسماں سے

شہید مصحفِ خوبی تمہارا
صدا قرآں کی دیتا ہے سناں سے

کدورت ہے تعلق اس چمن کا
بناؤں گا میں جاروب آشیاں سے

لرزتی ہے سرِ بالیں تمنا
کہ وصلِ نازنیں ہے ناتواں سے

گرایا خاک پر سر سے اٹھا کر
لڑی نالے نے کشتی آسماں سے

اگر کوندی مرے نالے کی بجلی
گرے گی برق چشمِ آسماں سے

وہ پھر محشر میں ہیں آمادۂ قتل
اب اے دنیا تجھے لاؤں کہاں سے

ہر اک تنکا تھا سیخ آتشِ عشق
گری بجلی پہ بجلی آشیاں سے

جہاں رہ جائے گا شہرِ خموشاں
اگر خالی ہوئی دنیا بیاں سے
(لسان الملک، میرٹھ: مارچ، اپریل ۱۸۹۹ء)

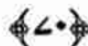
﴿۶۹﴾

آئینہ ہم دکھا نہیں سکتے — اس کو سکتے میں لا نہیں سکتے
دل کسی کو دکھا نہیں سکتے — دل کسی کا دُکھا نہیں سکتے
کھل کے وہ زلف اور پھیل گئی — اب دل و دیں بچا نہیں سکتے
پاؤں رکھتے بھی وہ زمیں پہ نہیں — کیا ہم آنکھیں بچھا نہیں سکتے
آنکھ کے سامنے سے دور اے طور — ٹھوکریں تیری کھا نہیں سکتے
تکیہ رکھتے ہیں دوست پر عشاق — اے جنوں سر اٹھا نہیں سکتے
شیشۂ دل کو چور کر تو دیا — خاک میں اب ملا نہیں سکتے
چشم ترسے بلند تر ہے مقام — میرے چھینٹوں میں آ نہیں سکتے
پس کے سرمہ ہوئے تو خوب ہوا — اب وہ آنکھیں چرا نہیں سکتے
کوئے دشمن میں ہے غبار مرا — مجھ سے آنکھیں ملا نہیں سکتے
سب ستاتے ہیں ہم کو یا اللہ — ہم کسی کو ستا نہیں سکتے
صبح سے ڈٹتے ہیں رقیب کے گھر — رخ سے زلفیں ہٹا نہیں سکتے
بے گناہی نے اور ظلم کیا — کہ وہ اب منھ دکھا نہیں سکتے
خوں کیا دل کا اور چلے کیا خوب — گھر میں قاتل چھپا نہیں سکتے
پاس خشکی کے ہو تری کیوں کر — لب سے ہم لب ملا نہیں سکتے
لاغری سے ہوا ہوں تارِ نقاب — مجھ سے اب منھ چھپا نہیں سکتے
دودِ دل سے بنا لیا ہے فلک — ہم سے جائیں تو جا نہیں سکتے
اے اثر ان کے اس تڑپنے کا — کیا تماشا دکھا نہیں سکتے

ناتواں ہیں تمھارے تیرِ نگاہ — چتکیوں میں اڑا نہیں سکتے
ناز سے خوں ہوا دیت نہ ہوئی — کہ وہ خنجر اٹھا نہیں سکتے
ناتواں ہیں خموش رہ ناصح — تیری باتیں اٹھا نہیں سکتے
دل مرا تنگ ہے بغل تو نہیں — کیا وہ پہلو میں آ نہیں سکتے
ان کی تصویر نقش ہے دل پر — اب وہ مہندی لگا نہیں سکتے
نہیں بھاتا پسا ہوا کوئی — کیا وہ مہندی لگا نہیں سکتے
گنگ تھے کر بھی ہو گئے ہوتے — سنتے ہیں اور سنا نہیں سکتے
ان کے محشر کو کردیا پامال — اب کسی سے ڈرا نہیں سکتے
تم کو کیا مرغ نامہ بر کی تلاش — سرِ عشاق اڑا نہیں سکتے
کیا ڈریں وہ کہ خوں ہوا پانی — اب کوئی رنگ لا نہیں سکتے

اے بیاں ہوتے اس کی رحمت کے
ہم جہنم میں جا نہیں سکتے

(لسان الملک، میرٹھ: اپریل،۱۸۹۰ء)



بروز حشر، ارمانِ دلِ بسمل نکلتا ہے — کہ گردوں اڑ گیا اور وہ مہِ کامل نکلتا ہے
قیامت آ گئی کشتہ ترا قاتل نکلتا ہے — غریق آبِ خنجر برسرِ ساحل نکلتا ہے
ہوئے ہیں خاک صدہا طالبِ دیدا سکے کوچہ میں — کہیں سے آنکھ کے ڈھیلے، کہیں سے دل نکلتا ہے
خدا ملتا نہیں ہرگز، خودی ملتی نہیں جب تک — یہ پردہ عاشق و معشوق میں حائل نکلتا ہے
فروغِ مہدیِ موعود تا صبحِ قیامت ہے — کہ جیسے چودھویں شب کو مہِ کامل نکلتا ہے
قیامت ہوتی ہے روپوش، جا خالی نہیں رہتی — لحد سے جب تری رفتار کا بسمل نکلتا ہے
ازل سے جوہر آسا، دل غریقِ آبِ خنجر ہے — ہر ارماں صورتِ ماہی مرا گھائل نکلتا ہے
ترے کنجِ دہن میں معجزے عیسیٰ سے چھپتے ہیں — ترے چاہِ ذقن سے جادوئے بابل نکلتا ہے

غشی آتی ہے ہر اک گام پر گر گر کے اٹھتا ہوں
مرا در لاغری سے سیکڑوں منزل نکلتا ہے

محبت ضبطِ دل سے موکشاں لاتی ہے نالوں کو
برنگِ شمع، دودِ دل، سرِ محفل نکلتا ہے

تڑپ جاتے ہیں فوراً حسنِ رخ کے دیکھنے والے
کہ دانہ ماش جادو کا ترا ہر تل نکلتا ہے

قضا کس کس کی آئی ہے عدم کو کون جاتا ہے
برہنہ تیغ لیکر آج وہ قاتل نکلتا ہے

بیاں کہہ دو قیامت سے اٹھا لیجائے حشر اپنا
ہزاروں حسرتیں لے کر ہمارا دل نکلتا ہے

(لسان الملک، میرٹھ: اکتوبر ۱۸۹۹ء)

﴿۱۷﴾

آئیں گے گر انھیں غیرت ہوگی
وہ نہ آئے تو قیامت ہوگی

حشر میں کون سنے گا فریاد
سد رہِ حدِّ سماعت ہوگی

تنگِ نظارہ ہے ہم چشمۂ عام
ہم نہ دیکھیں گے جو رویت ہوگی

یک طرف ہو کے رہیں گے یکرنگ
ہم کو اعراف سے نفرت ہوگی

شکوہ ہے دینِ وفا میں احداث
مجھ سے کا ہے کو یہ بدعت ہوگی

ہیں قیامت میں تامل کیا کیا
وصل کی کون سی ساعت ہوگی

ریگ ہوں، چاہیے دریائے شراب
میکدے پر نہ قناعت ہوگی

ہے شبِ وصل دو عالم گیسو
وہ جبیں صبح شہادت ہوگی

بحر رحمت ہے دو عالم کو محیط
میرے مشرب کی سی وسعت ہوگی

مے سے آلودہ ہوا دامنِ حسن
متہم خون کی تہمت ہوگی

کھینچتا تھا کوئی ان کا دامن
خاک میں وصل کی حسرت ہوگی

راس ہے چارۂ بالشل مجھے
قید سے اور بھی وحشت ہوگی

شعلہ رو پڑھتے ہیں کلمہ تیرا
شمع انگشت شہادت ہوگی

غیر کی آگ میں جلنے نہ دیا
حسن کی سی کسے غیرت ہوگی

واشدہ غنچۂ خاطر مت مانگ — منتشر بوئے محبت ہوگی
زہر لگتی ہے انھیں میری حیات — کیوں کہ منظور شہادت ہوگی
کھا گئے نرگسِ شہلا کا فریب — کہ ان آنکھوں میں مروّت ہوگی
تیری زلفوں نے چڑھائے چلّے — دل کی اس کوچہ میں تربت ہوگی
بن گئے سات جہنم تہہِ خاک — کس کے پہلو میں یہ حدّت ہوگی

کہیں سر پھوڑ کے مر رہیے بیاں
اک جہاں سے تو فراغت ہوگی

﴿۷۲﴾

کسی خورشید قیامت نے نظر کی ہوتی — یوں گر اٹھ اٹھ کے قیامت نے سحر کی ہوتی
اس نے نیچے سے جو اوپر کو نظر کی ہوتی — تو صفِ حشر ابھی زیر و زبر کی ہوتی
جیت کیا جانے دمِ ذبح کدھر کی ہوتی — نگہِ یاس سے گر تیغ نظر کی ہوتی
گر لگاتے نہ گلے سے تری تلوار کو ہم — تو کسی گھاٹ کی ہوتی نہ یہ گھر کی ہوتی
حسرتِ وصل ہوئی خاک تو کیا خاک ہوئے — خاک ہوتی تو تری راہ گزر کی ہوتی
اے فلک گردشِ ایام کا رونا کیا تھا — وصل کی رات بھی گر چار پہر کی ہوتی
لو کسی شوخ سے در پردہ لگا رکھی ہے — ورنہ کیوں شمع نے رو رو کے سحر کی ہوتی
اڑ کے جاتا ترے ہاتھوں سے کہاں رنگِ حنا — اس میں اک بوند اگر خونِ جگر کی ہوتی
ہے نہاں پردۂ ہستی میں کوئی مایۂ حسن — ورنہ پھیری، نہ ادھر شمس و قمر کی ہوتی
جائے زر گر، درۂ یار کے ذرے ملتے — گر کہیں جامہ تلاشی، گلِ تر کی ہوتی
یہ تن و توش، یہ دن سن، یہ نزاکت، یہ جھجک — سر مہم آپ سے کیوں کر مرے سر کی ہوتی

جانے دیتے نہیں جنت میں گنہگاروں کو
اے بیاں شافعِ محشر کو خبر کی ہوتی

(لسان الملک، میرٹھ: اگست ۱۸۹۸ء)

﴿۷۳﴾

نشانِ جادۂ الفت، نہ تھا کم نقشِ مسطر سے
قلم کی طرح سر دے کر بھی، ہم چلتے رہے سر سے

قیامت آ کے ٹکراتی ہے سر قبروں کے پتھر سے
الٰہی کس بتِ کافر نے چکرایا ہے ٹھوکر سے

ندامت واعظا کیا کیا نہ ہوگی آبِ خنجر سے
ہماری تشنگی گر بجھ گئی جنت میں کوثر سے

کہاں نقصانِ قسمت کم ہوا احسانِ خنجر سے
کہ سر اترا مرے تن سے نہ بوجھ اترا مرے سر سے

شہیدوں کے سروں کا کیا کہوں زیر و زبر ہونا
کہ چڑھتے ہیں تو نیزہ سے اترتے ہیں تو محشر سے

یہی طولانیاں ہوں گی تو پھر انصاف کیا ہوگا
شبِ ہجراں نکل جائے نہ آگے روزِ محشر سے

پئے قطعِ شبِ ہجراں ہوا دم بند تیشہ کا
یہ ہے کوہِ مصیبت کوہکن کٹتا ہے خنجر سے

انھیں کی شوخیوں سے ہم نے اندازِ جنوں سیکھے
چلے ہم سوئے بر اٹھ کر وہ جب اٹھنے لگے بر سے

گنہگارِ کریمی ہوں جہنم کے بجھانے کو
نمی لے جائے زہدِ خشک میرے دامنِ تر سے

کیا ہے قتلِ عام اس شوخ کی چشمِ شرابی نے
تماشا ہے کہ خوں ٹپکا کیا گلگلوں کے ساغر سے

مزا ہو گر پس از کشتن برنگِ شمع جی جائیں
کہ صرفِ ناز ہوں روزِ جزا پھر ہم نئے سر سے

نہ پھوٹے تا کسی رشکِ چمن کے عشق کی خوشبو
صدا دی قبر نے ڈھک دو مجھے پھولوں کی چادر سے

بیاں کیا خوفِ مہرِ حشر، میری سائبانی کو
نکل آیا ہے سایہ زیرِ دامانِ پیمبر سے

﴿۷۴﴾

کہا چشمِ تر کو نئی سوجھتی ہے
کہا دے کے طعنے کئی سوجھتی ہے

ہوا ہے ان آنکھوں سے یرقانِ اسود
کہ ایک ایک شے سرمئی سوجھتی ہے

قیامت میں واعظ کو دیدار ہوگا
بہت دور کی لو بھئی سوجھتی ہے

طبیعت گری پڑتی ہے ناتوانی
کسی در پہ دے گی ڈھئی سوجھتی ہے

مئے تند کی گرمیاں چڑھ رہی ہیں
نومبر میں ساقی مئی سوجھتی ہے

سمائی ہے آنکھوں میں یکتائی اس کی
وہ احول ہیں جن کو دوئی سوجھتی ہے

کمر میں گرہ دی ہے تارِ نظر کی یہ باریک بیں ہے نئی سوجھتی ہے
سفینے میں جاتا ہوں عمرِ رواں کے ہر اک چیز چلتی ہوئی سوجھتی ہے

بیاں بس کہ رہتا ہے حج کا تصور
تو میرٹھ میں بھی بمبئی سوجھتی ہے

﴿۷۵﴾

لہو ٹپکا کسی کی آرزو سے ہماری آرزو ٹپکی لہو سے
یہ ہے کس کا سویم پوچھا عدو سے کہ دم ہے ناک میں پھولوں کی بو سے
وہ بچہ پرورش کرتی ہے الفت جو پیکاں پوروے کی طرح چو سے
یہ ٹوٹے گی ہوائے گل سے واعظ مری توبہ کو کیا نسبت وضو سے
اسے کہتے ہیں قمری طوقِ الفت چھری لپٹی ہوئی ہے یاں گلو سے
یہ تاثیرِ محبت ہے کہ ٹپکا ہمارا خوں تمھاری گفتگو سے
وہ ہیں کیوں حسن کے پردہ پہ نازاں یہ سیکھا ہے ہماری گفتگو سے
کیا ہے دامنِ محشر کو افشاں اڑے چھینٹے یہ کس کس کے لہو سے
سنا ہے جام تھا جمشید کے پاس ارے ساقی فقیروں کے کدو سے
وہ شرمیلی نگاہیں کہہ رہی ہیں ہٹا دو عکس کو بھی روبرو سے
لبِ گلرنگ پر ہے خالِ مشکیں مگس اور پھول کی پتی کو چو سے

بیاں خوفِ گنہ سے مر چکے تھے
مگر جاں آگئی **لاتقنطوا** سے

(لسان الملک، میرٹھ: فروری ۱۸۹۷ء)

﴿۷۶﴾

سیاہی غیر کے منھ سے جھڑی ہے مسی کیا خوب کیا اچھی دھڑی ہے
کیا قسمت کی کوتاہی نے بسمل تمہاری تیغ کب اوچھی پڑی ہے

بڑی مقتل میں ہے اس صف کی شامت جو ان کے تیر کے پلے پڑی ہے
ہوں زاہد حافظِ ناموسِ رندی کہ دختِ رز مرے گھر میں پڑی ہے
دکھادی بتکدے میں کس نے صورت کہ ہر تصویر سکتے میں کھڑی ہے
مری آہِ حزیں سے اڑ گئے کان عدو نے آن کر کیا کیا جڑی ہے
جنوں پابستۂ زنجیر کیا خوب کسی بیدرد نے اچھی گھڑی ہے
جب اٹھا ہے وہ آشوبِ قیامت قیامت تھر تھرا کر گر پڑی ہے
سکندر اس سمندر میں نہ آیا بھنور ہے چشم کا تپلی کھڑی ہے
نثارِ بادشاہِ حیدر آباد ہماری نظم موتی کی لڑی ہے
درِ محبوب پر بستر جمائے حضورِ عرش اپنی جھونپڑی ہے

بیاں ان کی گلی میں اک کنارے
پڑے ہیں ہم کسی کو کیا پڑی ہے

﴿۷۷﴾

وہ دریا بار اشکوں کی جھڑی ہے کہ حوتِ آسماں تہہ میں پڑی ہے
مرے ارماں بتوں کی سرد مہری زراعت برف کے پالے پڑی ہے
چمن میں سرو کا بھروپ بھر کر قیامت منتظر کس کی کھڑی ہے
دہانِ تنگ غنچہ، پتیاں لب ہنسی ہے پھول، فقرہ پنکھڑی ہے
لگادی آگ کس شعلہ نے بلبل ہر اک پھولوں کی ٹہنی پھلجھڑی ہے
نگاہِ یاس کس کی کر گئی چوٹ کہ گردن تیغ کی ڈھلکی پڑی ہے
عناصر جلد پہنچا دیں گے تا گور نہایت تیز رو یہ چوکڑی ہے
کفن سے منھ لپیٹے میری حسرت دلِ ویراں کے کونے میں پڑی ہے
سرہانے مدعی آیا تو جانا جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے
کسی کو پار اتارے گا فلک کیا اسی کی ناؤ چکّر میں پڑی ہے

بنالے عقل کا پتلا فلاطوں
کہ تلچھٹ کچھ مرے خم میں پڑی ہے

نشہ ہے اور ہرن ہیں اس کی آنکھیں
نظر بازی ہرن کی چوکڑی ہے

نگاہِ شوق سے سینہ چرایا
ہماری چوٹ تم سے بھی کڑی ہے

بلائے زلف مہماں سے کہوں کیا
نہیں ٹلتی مرے سر آپڑی ہے

سیاہی دور ہوگی رفتہ رفتہ
ابھی زاہد کی ڈاڑھی کڑبڑی ہے

سرِ محشر بڑھی ہے کس قدر زلف
قیامت کس قدر اوچھی پڑی ہے

گہر بیں ہے نظام الملک اپنا
طبیعت کیا بیاں قسمت لڑی ہے

﴿۷۸﴾

یہ تعمیر کہن ہم سے کھڑی ہے
کہ نالہ سقفِ نیلی کی کڑی ہے

غضب کی سورما ہے آنکھ تیری
تنِ تنہا ہزاروں سے لڑی ہے

قیامت کب ہو قامت کے برابر
یہ اس سے اک قدِ آدم بڑی ہے

طلب سے یار کی نعمت فزوں ہے
غضب سے یار کی رحمت بڑی ہے

جما ہے ضعف کا نقشہ یہاں تک
انگوٹھی ان کی میری ہتھکڑی ہے

سرہانے اس کا جلوہ ہو دمِ نزع
یہی ہٹ ہے اسی پر سانس اڑی ہے

دلادے خوں بہا قاتل سے یارب
سرِ محشر مری حسرت کھڑی ہے

رہے جاتے ہیں پیچھے حضرتِ خضر
ابھی کوسوں مری منزل پڑی ہے

بکھر جائے نہ دل عشقِ بتاں میں
یہ خوں کی بوند پتھر پر پڑی ہے

اٹھایا ہے سرِ شوریدہ جس دم
مرے پاؤں پہ دیوار آ پڑی ہے

دلِ پُر داغ دے کرلیں گے بوسے
گلِ رخسار میں پتی لڑی ہے

پسینے سے ہوئے عارض گلِ تر
یہ اچھی اوس پھولوں پر پڑی ہے

تمہاری بزم میں کھل کر پئیں گے
ہمیں جنت میں کیا چوری پڑی ہے

عدم اور موت سے ہستی کو کیا بحث | یہ ناداں بیچ میں کیوں آ پڑی ہے
جگر ہے یا کوئی گنجِ شہیداں | سناں تیری مری حسرت گڑی ہے

بیاںؔ ہمراہ لینا خضرِ توفیق
کٹھن ہے راستہ منزل کڑی ہے

﴿۷۹﴾

دل اچکے گی کہ بکھری ہے اڑی ہے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
چھپے گا کب ہمارا خونِ ناحق | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
کہیں بادِ صبا آگے نہ دھر لے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
عدو اس ریسماں سے سر نہ چڑھ جائے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
کمند اس گھات سے پھینکی ہے کس پر | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
کسی کا خونِ ناحق سر نہ ہو جائے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
جفائیں موبمو آتی ہیں آگے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
کہیں موئے میاں بل کھا نہ جائے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
اڑایا دل گرہ کترے گی کیا اور | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
غضب تھا سامنا تُرکِ نظر کا | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
کسی کا خون گردن پر نہ چڑھ جائے | یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

بیاںؔ کم تھی ہماری تیرہ بختی
یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

(لسان الملک، میرٹھ: اپریل ۱۸۹۸ء)

﴿۸۰﴾

جان دی بخش دیئے گنجِ فراواں تو نے | اس کفِ خاک پہ کیا کیا کیے احساں تو نے
کیا ہوا ان کو، اتارے تھے جو مہماں تو نے | کچھ بتایا نہ لبِ گورِ غریباں تو نے

شور کس کا صفِ محشر سے دھواں اٹھتا ہے
صور کیا پھونک دیا نالۂ سوزاں تو نے

عمر بھر قید رہا ہائے جواں مرگ موا
کچھ بھی دنیا میں نہ دیکھا مرے ارماں تو نے

آئینہ میں رخِ معشوق سے گیسو نے کہا
کر دیا مجھ کو مری جان پریشاں تو نے

اے جنوں تختۂ تابوت اڑا جاتا ہے
مور بے پر کو دیا تختِ سلیماں تو نے

اے تڑپتے ہوئے نخچیر بتا کون ہے تو
کس غضب کے کیے نالے نمک افشاں تو نے

تھا رگ و پے میں تری کس نمکِ حسن کا شور
کر دیا عرصۂ محشر کو نمکداں تو نے

دامنِ شوخ تو کیا چھو نہ سکے گردِ سمند
ہار دی بازیِ جاں عمرِ گریزاں تو نے

تھا تری زلف سے کیا تارِ نفس کا رشتہ
کر دیا ہر متنفس کو پریشاں تو نے

او نکیلے تری رفتار سے کٹتے ہیں گلے
کس سے سیکھی یہ روشِ خنجرِ براں تو نے

ناز ہے بلبلِ گویا کو سنا دیجے بیاں
ابھی دیکھے نہیں واللہ غزلخواں تو نے

﴿۸۱﴾

جب کہا المدد اے شافعِ عصیاں، تو نے
اے بیاں مار لیا حشر کا میداں تو نے

کھو دیا دل کو کہاں یار کے پیکاں تو نے
میزباں نوش کیا کیا مرے مہماں تو نے

کیا چنی دامنِ معشوق پہ افشاں تو نے
رنگ دیا حشر کو اے خونِ شہیداں تو نے

کون آتا ہے قیامت کسے شرم آتی ہے
کہ مرا خون چھپایا تہہِ داماں تو نے

نہ کوئی شکلِ رہائی ہے نہ پھندا ہے کوئی
قید کیا خوب کیا گیسوئے دوراں تو نے

یہ ہماری رگِ گردن ہے کہ خوں دیتی ہے
بوند پانی نہ دیا خنجرِ براں تو نے

دامنِ دشتِ قیامت ہے اک اوچھی سی گلی
گل کھلائے عجب اے چاک گریباں تو نے

واہ رے سوزِ محبت کہ بن آئے نہ بنی
دل کو پھونکا صفتِ نقش پری خواں تو نے

کہہ نہ دینا صفِ محشر کوئی منہ دیکھی بات
گیسوئے یار اٹھایا تو ہے قرآں تو نے

صفِ عشاق تو کیا دی صفِ محشر کو شکست
کیے فتنے کئی بھرتی صفِ مژگاں تو نے

کوستے ہیں کہ نہ ہو گور و کفن تجھ کو نصیب
کی سرِ عام دلہن تیغ سے عریاں تو نے

مسکرا کر تنِ بے سر سے کہا ظالم نے
کہیں رکھا بھی مری تیغ کا احساں تو نے

تھے ترے مصرعِ قامت میں قیامت مضمون
جس سے ترتیب دیا حشر کا دیواں تو نے

خونچکاں حشر میں ہم رنگ شہید آیا ہے
یاں نیا روپ بھرا ہے مرے ارماں تو نے

قد کے فتنے ترے محشر پہ سوار آتے ہیں
کر دیا گردِ قیامت کو مری جاں تو نے

حلق پر تیغ تو ہونٹوں پہ ہنسی پھرتی ہے
کس بشاشت سے بیاں یار کو دی جاں تو نے

(لسان الملک، میرٹھ: اپریل ۱۸۹۸ء)

﴿۸۲﴾

گھبرا کے جہاں سے یہ ستم کش ترے گھر جائے
اور در ہو ترا بند تو بتلا کہ کدھر جائے

رشک آئے ہے، غمخوار مرا حال نہ کہنا
میں جا نہ سکوں واں تلک اور میری خبر جائے

ہر گام پہ حسرت کا اٹھائے ہوئے چلنا
اس کی نہیں پروا کہ جیئے یا کوئی مر جائے

دل دیں گے ہم اس کافر بد عہد کو، سو بار
دے کر کوئی لیتے ہیں، مکر جائے، مکر جائے

ہے جادہ بھی واں، موجۂ آبِ دمِ شمشیر
گزرے وہ ترے کوچہ میں اور سر سے گذر جائے

دونوں کی نکل جائے تمنائے شہادت
سر سے تری شمشیر اگر دل میں اتر جائے

ہٹ ہٹ کے اندھیرا نہ کرو آنکھوں کے آگے
واں تک تو نظر آؤ جہاں تک کہ نظر جائے

اے بادِ صبا درہم و برہم نہ کر ان کو
ڈرتا ہوں کہ وہ زلف مجھی پر نہ بکھر جائے

کیا پوچھتے ہو وضعِ جنوں خیز بیاں کو
اس طرح نہ یارب کوئی ہستی سے گذر جائے

﴿۸۳﴾

تہمت قتل مٹانے سے نہیں جانے کی
خون ناحق مرا سرخی ہے ہر افسانے کی

اب مجھے کھو کے نہ روؤ کہ اگر روئیگی شمع
جان پڑ جائیگی کیا خاک میں پروانے کی

ہڈیاں راکھ میں ڈھونڈے نہ ملی تجھ کو ہما — شکوہ مت کیجو کہ خوشی مجھے غم کھانے کی

آندھیاں آتی ہیں ہر سال کوئی شوریدہ — خاک اڑاتا ہے ابھی تک کوئی ویرانے کی

سنگ اسود ہے حرم میں مجھے ڈر ہے واعظ — کہیں پڑ جائے نہ بنیاد صنم خانے کی

اثر سوزش تاثیر محبت مت پوچھ — ہوگئی شمع ستی آگ میں پروانے کی

اٹھ گئے خلق سے سب اہل کرم یا کہ بیاں
مجھ ہی کمبخت سے کرتا نہیں کوئی نیکی

متفرقات

سارے جہاں کے دل میں تیرا مقام نکلا　　تو ہم سے بھی زیادہ رسوائے عام نکلا
ہر ایک شے میں پنہاں تیرا مقام نکلا　　توڑا جو بتکدے کو بیت الحرام نکلا

حوروں سے جالڑی، کبھی پریوں پہ آپڑی
کس کس سے رشتہ ہے نگہہ پاکباز کا

ہماری نعش کا احساں رہے گا محشر پر　　کہ منحصر ہے زمانہ کسی کی ٹھوکر پر
کبھی رُکا ہے اگر دستِ نازنیں اس کا　　تڑپ کے ہم نے گلا رکھ دیا ہے خنجر پر
اسے قرار نہیں اور مجھے قرار نہیں　　مرے قدم کے تلے آگ شمع کے سر پر

حسرتیں دل میں دبادیں شب فرقت لے کر
حشر میں جاؤں کہاں اپنی مودّت لے کر

تو ہی اے تیشۂ فرہاد بتادے کوئی چال　　ان بتوں کے دلِ سنگیں میں ہوں راہیں کیوں کر
شمع کہتی ہے مرے سر سے دھواں اٹھتا ہے　　تو نے روکیں دلِ پُرسوز میں آہیں کیوں کر
پھرتے ہیں کوچۂ گیسو میں، بھٹکتے ہی بیاں　　قطع کیں خضر نے ظلمات کی راہیں کیوں کر

ہزاروں انگلیاں اٹھتی ہیں ان پر رہ گزاروں میں
کہ وہ ہیں ایک ماہِ عید، لاکھوں میں، ہزاروں میں

وہ گل ہیں سیکڑوں میں ایک، ہم کہہ دیں ہزاروں میں
طرحداروں میں، مہ پاروں میں، طراروں میں، پیاروں میں

نہاں ہے دانۂ تسبیح میں زنّار کا ڈورا
مبارک اے برہمن شیخ بھی ہے رشتہ داروں میں

نشاط انگیز تھا جھونکا نسیمِ نو بہاری کا
اچھل کر جارہی واعظ کی پگڑی بادہ خواروں میں

فلک کو دونوں آنکھیں ایک سی ہوتیں تو کیوں کٹتی
کسی کی شب نظاروں میں، کسی کی انتظاروں میں

آپ لوگوں کی جان لیتے ہیں — تہمتیں آسمان لیتے ہیں
اے فغاں پھر زمیں دکھا دینا — دون کی آسمان لیتے ہیں

اشک کی فوج ہے، نالوں کے الم چلتے ہیں — وادیِ عشق میں کس دھوم سے ہم چلتے ہیں
ہمسفر کوئی نہیں، عالمِ تنہائی ہے — نکل اے آہ، اٹھ اے درد کہ ہم چلتے ہیں

وادیِ عشق کی منزل نہیں ہوتی سونی
پاؤں رہ جاتے ہیں چلنے میں تو دم چلتے ہیں

دل ہوا اشکِ مسلسل سے خراب — رکھیے برسات میں اسباب کہاں
ناخدا کوئی نہیں اپنے سفینے کا بیاں — آج طوفاں کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

نہیں میں آپ میں، اور وہ ہیں مجھ میں — عجب ویرانہ آباد ہوں میں
کیا بیاں کیجیے فریاد کہ وہ
زلف سے دستِ دعا باندھتے ہیں

بت ترے گھر میں چھپا کر رکھے — عفو کر عفو خدایا مجھ کو
آنکھ ہر ایک سے لڑتی ہی رہی — کہ وہ ہر سو نظر آیا مجھ کو

چمن ہے، انجمن ہے، ابر تر ہے، آب احمر ہے — فلک وہ شوخ بھی ایسے میں آجائے تو پھر کیا ہو

حیا ٹوٹی، حجاب اٹھا، نقاب الٹا، قبا اتری مچل کر کوئی ارماں اب نکل آئے تو پھر کیا ہو

بیاں عاصی ہے پر کس بخشنے والے کا عاصی ہے
مرے لینے کو جنت واعظا آئے تو پھر کیا ہو

ہر کام میرا کشمکش خیر و شر میں ہے چشمک تری نگہ سے قضا و قدر میں ہے
اختر نہیں، درم ہیں یہ کس کا حریف تھا خوں کا صلہ سپہر کہن کی سپر میں ہے

تم سے چھٹا تو اہلِ وفا کو غرض نہیں
جب تک کہ چٹکیوں میں ہے ناوک جگر میں ہے

کرتے ہیں خاک شیشۂ ساعت کو منقلب برہم زنِ سپہر ہمارا غبار ہے
لو شمع اس کے حلق بریدوں میں مل گئی انگلی کٹا کے یہ بھی شہیدوں میں مل گئی
کوئی آئینہ دکھا کر مرے واعظ سے کہے کس کے ماتھے گئی تحریر سیہ کاروں کی
قبلۂ صدق و صفا کعبے سے کوسوں دور ہے شیخ صاحب کو ابھی سعی فراواں چاہیے
نہ پھوٹے تا کسی رشکِ چمن کے عشق کی خوشبو صدا دی قبر نے ڈھک دو مجھے پھولوں کی چادر سے
دلہن بھی یوں کوئی دولہا کے گھر نہیں جاتی گلوئے شوق پہ کیا تیغ بانکپن سے چلی
ادا نکلی، حیا نکلی، یہی کافر نہیں نکلی ہماری آرزو تم سے سوا پردہ نشیں نکلی

نزاکت سے ہوا اقرار بھی انکار سے بدتر
کہ ہاں نکلی دہن سے اس طرح گویا نہیں نکلی

قصائد

﴿۱﴾

قصیدہ در مدح حضرت علیؓ

عید غدیر کا ہے دن، عام ہے عیش پروری
خم میں جھلک رہی ہے مے جھوم رہے ہیں حیدری

جوشِ مئے طہور ہے، دورِ سرورِ سور ہے
رنگ سے چشمِ حور ہے، رشک دہ گل تری

دور ہوئیں خرابیاں، مے سے بھری گلابیاں
نشہ میں کرشتابیاں، مست ہیں، جرم سے بری

خلد سے ہے چمن قریب، پھول کھلے کھلا نصیب
بول رہی ہے عندلیب، پھول رہی ہے جعفری

زیرِ فلک ہے چارسو، شورِ کلوا والشربو
بادہ بنوش تا گلو، تا ز نشاط برخوری

شاد ہیں رندو متقی، غنچہ و گل ہیں فندقی
صحنِ زمیں ہے فستقی، بادِ نسیم عنبری

جلوۂ گل ہے سوبسو، روئے مراد روبرو
شاخِ نہال آرزو، آج ہے کیا ہری بھری

حمد علی الصباح کہہ، حی علی الفلاح کہہ
دورِ قدح مباح کہہ، یعنی ہے بادہ کوثری

خلد ہے بزمِ بوتراب، حور ہے ساقیِ شراب
شیشہ کنار میں دبا، ہاتھ پہ ہے گزک دھری

ہر گلِ تر ہے سرسبد، حق کے کرم ہیں بے عدد
کہتے ہیں یا علی مدد، طیر دمِ نواگری

شاہ سریر "انما" ماہِ سپہر "ھل اتیٰ"
نیرّ اوج لافتیٰ، مرجع مہر خاوری

تھا شبہِ ذوالجلال تیغ، جلوہ دہِ کمال تیغ
بدر شکن ہلال تیغ، مثلِ کتاں، ہے صفدری

اس نے دیے دمِ جہاد تیغ کے گھاٹ سے اتار
بحرِ فنا میں خندقی، نارِ سقر میں خیبری

اس کی جسامِ خضرے غازہ کشِ عرب ہوئے
خونِ حسود سے ہوا، روئے یقیں محمری

آپ چڑھے جہاد پر چرخ سے اُتری ذوالفقار
زیر و زبر ہوا جہاں، دہر میں آئی ابتری

پنجۂ قلعہ گیر میں، تیغ زنی تہمتنی
ناخنِ تیغ تیز میں سب شکنی غضنفری

قلعہ شکن، عدو فگن، دیو شکار، تیغ زن
جوشن بازوئے رسول، خاتمِ دستِ داوری

زوجِ مطہر بتول، بابِ مدینۃ الرسول
شاہ نجف، فقیر دوست، عقدہ کشا، سخی، جری

سنگ ہے تیرے فرش پر دنگ سے تیرے روبرو
جامِ جہاں نمائے جنگ آئینۂ سکندری

خاکِ قدم سے کر لیا آئینۂ ضمیر صاف
رکھتے ہیں تیرے خاکسار دبدبۂ سکندری

تیرے عصائے تیغ سے، پست ہوئے فراعنہ
معجزۂ کلیم سے مات ہے سحرِ سامری

چشم میں روئے مصطفیٰ برقعِ نور میں ہے شمع
دل میں ولائے مرتضیٰ، بند ہے شیشہ میں پری

زندہ کیا کلام کو پست حسودِ خام کو
سحر بیاں، بیاں ترا، معجزہ ہے سخنوری

(لسان الملک، میرٹھ: جولائی، اگست ۱۸۹۲ء)

﴿۲﴾

قصیدہ در مدح جنرل محمد اعظم الدین خاں

مدار المہام ریاست رام پور

برسوں کٹورے نیل میں دوڑائے آفتاب
ذرّہ اس آفتاب کا کب پائے آفتاب

دیکھے جمال یوسفِ مصری جلال کا
منہ پہلے رودِ نیل میں دھوآئے آفتاب

دیدار شام کو ہے میسر نہ صبح کو
جوشِ شفق ہے خون تمنائے آفتاب

پھرتا ہے ڈھونڈتا ہوا اس جلوہ گاہ کو
دن رات شوقِ ناصیہ فرسائے آفتاب

رکھتا سپہر پر نہ کبھی کہربا سے پانو
ہے ہے وہ نقشِ پا نہ ہوا جائے آفتاب

اس شمع کا فروغ گر آئے نظر کہیں
شانِ عسل کی طرح پگھل جائے آفتاب

کیا رعب حسن ہے کہ زمیں زلزلہ میں ہے
تپ لرزۂ کہن میں سراپائے آفتاب

پھرتا ہے جھانکتا ہوا کیا شرق و غرب میں
رخنہ حریمِ دوست میں کب پائے آفتاب

چوگانِ زلفِ دوست کے نزدیک کھیل ہے
گو سر کے بل اِدھر سے اُدھر جائے آفتاب

روزِ نخست سے یرقانی ہے عشق کو
عیسیٰ سے ہو سکے نہ مداوائے آفتاب

ہے سر تو اے جنوں تنِ بے سر کہا گیا
کیا طعمۂ اسد ہوئے اعضائے آفتاب

اسرارِ فیضِ ساقیِ انوار فاش ہیں
اوچھا ہے ظرف ساغرِ صہبائے آفتاب

چمکے وہ برقِ حسن تو خلطِ بصریہ ہو
چوٹی سے کہسار کی ٹکرائے آفتاب

اس لمعۂ جمال سے ہو جائے گم ابھی
شپر کے آشیانہ میں عنقائے آفتاب

خاکِ در اس کی مہر نمازِ نیاز ہے
اور خانقاہ چرخ مصلائے آفتاب

ہر ذرہ آفتاب بنے اس کی مہر سے
کہہ دو سپہر سے کہ نہ اترائے آفتاب

جنرل محمد اعظمِ دیں خاں کو اس نے دی
وہ تاب جس کو دیکھ کے جل جائے آفتاب

دارالسرور کا وہ مدارالمہام ہے
اور اس کا دربدار مدارائے آفتاب

سایہ رئیس کا ہے وہ، قوت رئیس کی
ہے پرچم لوائے مطرائے آفتاب

گرم عناں ہو شوقِ زمیں بوس میں نہ کیوں
دن رات یوں سکندریاں کھائے آفتاب

اس کی طرف اضافتِ معراجِ نور ہے
ترسا سے سن نہ گبر سے معنائے آفتاب

عید الضحیٰ کو مصحفِ روئے نکو سے ہے
والشمس جلوہ گر و ضحٰہائے آفتاب

مشرق سے آج صبحك الله کا شور ہے
وا ہے زبان تہنیت آرائے آفتاب

وہ آفتاب ہند ہے اور اس کے سامنے
ہے اک چراغ روز تجلائے آفتاب

خاکِ دراس کی کیوں نہ ملی تو نے اے فلک!
کھوتی قمر کا برص تو صفرائے آفتاب

از بسکہ اس کا تابعِ فرماں رہا سدا
حق نے دیا سپہر کو تمغائے آفتاب

دیدار کی طلب ہے تو مل جائیگا کبھی
بے جا ہے روز کا یہ تقاضائے آفتاب

وہ داورِ سپہر حشم، میرمہ علم
روشن ہے جس کے نام سے طغرائے آفتاب

وہ نامور کہ لکھ کے خطوطِ شعاع سے
اوراقِ زر پہ جس کی ثنالائے آفتاب

رہتی ہے روز عشرتِ جمشید ورنہ صبح | آتی ہے لے کے جار مطلائے آفتاب
حربا ہو اہلِ قبلۂ رخ دیکھ لے اگر | اس مہہ کے جلوہ گہہ میں تماشائے آفتاب

پڑھ دوں پھر ایک مطلعِ روشن حضور میں
جس کے طلوعِ نور سے شرمائے آفتاب

فرماں اگر نہ تیرا بجالائے آفتاب | بامِ مسیح سے ابھی گر جائے آفتاب
خورشید ہے ترا ورقِ عارضِ مبیں | اور آفتابِ چرخ مثنّائے آفتاب
تو محتسب ہے اور وہ ہے متہم بہ مے | آئے خمِ فلک میں تو ڈھل جائے آفتاب
تو پاسبانِ شرح ہے شرم مجوس سے | آگے ترے رسن بہ گلو آئے آفتاب
ترا علم ہے نیرِاعظم جہان میں | تو نے کیا ہے حلِ معمائے آفتاب
گر معرکے میں زور ترا، نیزہ باز ہو | غربال سب کو آئے نظر جائے آفتاب
تیرا مرید، عابدِ شب زندہ دار ماہ | تیرا مطیع قاضیِ بیضائے آفتاب
دفتر ترا سپہر، ترے کارکن نجوم | منشی ترا دبیرِ فلک رائے آفتاب
جس سرزمیں پہ جلوہ فشاں ہو ترا جمال | تا سمت راس ہووے نہ اعلائے آفتاب
دورہ تو مملکت میں ترا سیرِ شمس ہے | خیمے ترے دوائرِ عظمائے آفتاب
سونا بنائے گا تری اکسیرِ راہ سے | پھرتا ہے کیمیا گرِ یکتائے آفتاب
جیبِ سحر سے کھینچ لیا تیرے شوق نے | لی تو نے بیعتِ یدِ بیضائے آفتاب
پڑتا ہے تیرے قلب کا اشراق مہر پر | جس طرح ماہتاب پہ القائے آفتاب
پہنچے نہ تیرے پایہ کو بامِ فلک تو کیا | روزِ نشور بانس پہ چڑھ جائے آفتاب
تیرے لیے ہے گلشنِ خضرائے آسماں | تیرے لیے ہے لالۂ حمرائے آفتاب
تیرے لیے ہے مسندِ دیبائے آسماں | تیرے لیے ہے تکیۂ زیبائے آفتاب
احجار تیرے واسطے رنگوائے، آسماں | اثمار تیرے واسطے پکوائے آفتاب
تیرے لیے ہے نقرۂ گیتی نورد ماہ | تیرے لیے ہے توسنِ شہبائے آفتاب

چلتا ہے تیرا پیل تو دبتا ہے آسماں
چمکے ترا سمند تو چھپ جائے آفتاب

دن بھر کی دوڑ دھوپ ترے رخش سے نہ ہو
پہلا قدم ہے وسعتِ صحرائے آفتاب

گر تیرے خوانِ جود سے روزینہ بند ہو
مطبخ سے کس کے نانِ تنک پائے آفتاب

سرمہ اگر نہ تیرے قدم کا غبار دے
ہوجائے کور دیدۂ بینائے آفتاب

معدن ہے سینہ، تو ہے گہر بیں، بیاں ہے لعل
کیا تیرے مدح سنج کو پروائے آفتاب

تو بارگاہِ جاہ و حشم کا مقیم ہو
جب تک سفر میں ہو تنِ تنہائے آفتاب

(لسان الملک، میرٹھ :جولائی ۱۸۸۹ء)

﴿۳﴾

قصیدہ در مدح نواب علی مراد خاں بہادر والیِ سندھ

سپہر جھک کے سلامی، ہوئے کہاں کے لیے
علی مراد بہادر سے جم نشاں کے لیے

وہ ہند کا مہِ انور، وہ سندھ کا والی
زحل ہے ہند، وہ راس کے آستاں کے لیے

وہ ہے رواقِ عماری میں بسکہ جلوہ فشاں
ترس رہے ہیں فلک، اوجِ پیلیاں کے لیے

ہے پُر گہر در بخشش سے کشتیِ فقرا
ہیں جائے قطرہ، دُر اس بحرِ بیکراں کے لیے

زہے ہوائے ترحم، غبارِ راہ ترا
عصا ہوا فلکِ پیرِ ناتواں کے لیے

وہی گروہِ کواکب میں ہے سعادت مند
کہ جس نے بوسے ترے سنگِ آستاں کے لیے

ترے حسود کا ڈھونڈے اگر سراغ کوئی
سنانِ نیزہ اک انگشت ہے نشاں کے لیے

مہبِ فیضِ سحر سے اگر نسیم سحر
گئی شگفتنِ گلہائے بوستاں کے لیے

محلِ لطفِ اتم سے ترے نسیم نفس
چلی ہے خندۂ دلہائے دوستاں کے لیے

خمِ تواضع گردن، فرارِ خلق ترا
ہے خاتمِ کفِ جم، صیدِ انس و جاں کے لیے

ترے نظیر کی ہیبت سے یاں بھی امن نہیں | گیا تھا سوے عدم فتنہ کیوں اماں کے لیے
ترے ضمیر کی فہرست، تیری لوحِ جبیں | کہ گنج نامہ ضروری ہے گنج داں کے لیے
صفِ نعال میں کی پارہ چادرِ مہتاب | ترے حشم نے قمر سے عوض کتاں کے لیے
بتاؤں کیا ترا کوچہ میں آفتاب کی طرح | کہ میں نے دور سے بوسے کہاں کہاں کے لیے
گلو پیاس سے تھا خشک اہلِ معنی کا | کفِ سخا سے ترے گھونٹ ایاغِ جاں کے لیے
ہنر ہے سایۂ گردوں میں سایہ ساں بے قدر | پھرا کیا کیے محفوظ سائباں کے لیے
سخن نے عرض کیا عجزِ دستگاہِ سخن | حسنِ دہن ہے قلم بلبلِ بیاں کے لیے
فضائے تنگِ جہاں نے زراہِ تنگدلی | جگہ نہ دی مرے طائر کو آشیاں کے لیے
مری بغل میں تڑپتے تھے میرے لختِ جگر | رواں فزائی امیدِ نیم جاں کے لیے
ہوائے شوق ترے در پہ لے گئی ناگاہ | خضر کے ساتھ ہوا عمر جاوداں کے لیے
نہیں اگر شرفِ بوالبشر نہ ہو میں نے | تری گلی میں مزے دعوتِ جناں کے لیے
طرارے بھرنے لگا تیرے فیض سے ورنہ | علف نہ تھا فرسِ رائضِ بناں کے لیے
مرے کلام کو بخشی حیاتِ جاویداں | ہوا یہ معجزہ اس عیسیٰ زماں کے لیے
سخن کو جود سے رونق، تو جود کو تجھ سے | شرف ہے دولتِ معنی سے، ہر بیاں کے لیے
عطا ہے تیرے لیے اور ثنا ہے میرے لیے | بیاں ہے تیرے لیے اور تو بیاں کے لیے

بیاں بقولِ اسد کس کی مدح میں نے لکھی
''کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے''
(جرمانہ آفتاب:۳،۲)

﴿۴﴾

قصیدہ در مدح مہاراجہ راج کنوار بہادر
فرماں روائے ریاست بشن گڑھ، ضلع فرخ آباد

نہ کیوں، جواہرِ کانِ جگر، کروں میں نثار
کہ آج فخرِ مہاراجگاں ہے، راج کنوار

ہوا ہے اس کی جوانی سے اس کا بخت جواں
ہوا ہے اس کے تلطف سے اس کا ملک بہار

ہے اس پہ سایہ فگن، آفتابِ قیصرِ ہند
کہ اس کے نام کا تمغہ ہوا ہے، مہر نگار

زمانہ اس کے تجمل سے، محفلِ جمشید
بشن گڑھ، اس کی تجلی سے مطلعِ انوار

ہے سبز و خرم و سیراب مزرعِ امید
کہ اس کا دستِ سخاوت، اک ابر ہے مدرار

ہنر پسند، ہنرمند، علم دوست، عقیل
ذکی، شجاع و بہادر، قوی، جری، جرار

وہ اس کا جاہ و حشم اور وہ اس کا حسن و جمال
وہ اس کا علم و عمل اور وہ اس کا عزّ و وقار

زمیں ہے خاکِ قدم اور زمانہ بندۂ در
قمر ہے حلقہ بگوش اور فلک ہے غاشیہ دار

محلِ نیرِّ اعظم ہوا سپہرِ عظیم
کبھی جو فیلِ فلک سیر پر ہوا وہ سوار

درست اس سے ہوا مملکت کا نظم و نسق
کہ جیسے زلفِ پریشاں بنائے شانۂ یار

وہ دلفریب نگاہیں، وہ منکسر ابرو
کہ بے کمند و کماں کر لیا دلوں کو شکار

ہوا ہے شحنۂ انصاف اس کا صید فگن
کہ بھاگتے ہیں چکارے کی طرح چور چکار

نقابِ خاک میں رستم نے منہ چھپایا کیوں؟
گیا اُدھر کوئی، کیا اس کی فوج کا سردار؟

حریف کون کہ میداں میں زلزلہ آ جائے
گر اس کا قصدِ شجاعت ہو جانبِ پیکار

قدم اٹھائے تو خورشید پھینک دے خنجر
نظر اٹھائے تو مریخ کھول دے ہتھیار

سبک ہو آنکھ میں سہراب و سام کا پلّہ
جو معرکہ میں وہ آ جائے تول کر تلوار

دماغ اس کا وہ نازک کہ ہو وہ چیں بہ جبیں
گر اس کے ملک میں آ جائے بوئے مشکِ تتار

یہ اس کے نقشِ قدم کو ہے اس کے رخ سے فروغ
کہ آفتابِ فلک کا ہے مطمحُ الانظار

یہاں سکندر و دارا کا ذکر لائے کون
ملے گا کیا گئے گزروں کو اس کی بزم میں بار

دعا یہ ہے کہ رہیں جب تلک زمین و زماں
فلک ہو نوکر و چاکر، خدا ہو یاور و یار

در مدح حفظ الکریم

دُرّۃ التّاجِ وفا، سرچشمۂ لطفِ عمیم
حافظِ ناموسِ الفت، ذی کرم، حفظ الکریم

میری قوت، میرے بازو، میرے بھائی، میرے دوست
مصدرِ مہر و مروّت، مظہرِ اسمِ کریم

مٹ گیا تھا صفحۂ ایجاد سے نامِ وفا
تو نے روشن کر دیا پھر اے کریم ابن الرّحیم

ہے فتوت کو تری قطرے سے کم، یم ہو کہ بحر
ہے تری رحمت کے آگے کنکری، زر ہو کہ سیم

منزلِ حسنِ سعادت میں ترا رخ مشتری
کعبۂ اخلاص میں جلوہ ترا شمعِ حریم

جوشِ ہمدردی سے ہمت ہے تری فیّاضِ خلق
پاس یک رنگی سے سیرت ہے تری بادِ نسیم

نکہتِ ریحانِ جنت ہے تری خوئے لطیف
جنبشِ بادِ بہاری ہے، ترا خلقِ عمیم

صورتِ یوسف دمِ عرضِ جرائم ہے رؤف
صورتِ یعقوب ہنگامِ غضب ہے تو کظیم

اس کو ہے کافور کا پھاہا، ترا مکتوبِ شوق
جس کا دل ہو ضربتِ تیغِ جدائی سے دو نیم

دل چرانے کا ہے کھٹکا طرۂ طرّار کو
کہ طراروں کو بھی تیرے کوتوالی کا ہے بیم

دوست داری ہے ولایت، اس ولایت میں ہے تو
بے نظیر و بے عدیل و بے بدیل و بے سہیم

نیک نیت، نیک دل، نیکو خصائل، نیک بخت
مہر صورت، مہر سیرت، مہرباں، عاقل، فہیم

تیرا لطفِ خاص ہے بے وارثوں کا خیر خواہ
دامنِ دریا کا سایہ ہے سرِ درِّ یتیم

تیرے سارے دودماں میں شانِ رحمت کا ظہور
تو کریم اور تیرے بھائی ہیں رحیم ابن الرحیم

تجھ کو دیتا ہے بیاں تیرا، دعا اخلاص سے
تا قیامت تجھ پہ ہو، لطفِ خداوندِ عظیم

(لسان الملک، میرٹھ: ستمبر ۱۸۹۸ء)

مثنویات

﴿۱﴾

مثنوی در صفتِ انبہ

فیضِ حق سے شکر فشاں ہیں آم　　تحفۂ نادرِ جہاں ہیں آم

چمنِ نادری کا تحفہ ہے　　منشی نادر علی کا تحفہ ہے

آم دنیا میں نام اسی کا ہے　　چشمۂ فیضِ عام اسی کا ہے

انبۂ نغز کہتے ہیں اس کو　　ہے بہارِ ریاضِ انبہ گو

ہر زباں اک شکرتری کردی　　اس نے شکر کی کرکری کردی

بس کہ ہے برتری محال اس پر　　شہدِ شیریں کی ٹپکی رال اس پر

داغی ہے ماہتاب کا سردہ　　ریشہ دار آفتاب کا زردہ

یاں جسے خاک، رنگِ گل ناری　　قند ہاری تو کیا ہے قندہاری

ذکرِ خرمائے تر نہ آئے راست　　کہیے اس کا سرنگ او خرماست

ہاتھ آسیب رشک سے مل جائے　　سیب کشمیر پر چھری چل جائے

کیوں نہ اس کی طرف بشر لپکے　　جن کا در ہے نہیں یہ وہ ٹپکے

نخل ایسا کوئی نہال کہاں　　نیشکر کی گرہ میں مال کہاں

کیوں نہ ہو سبز نیشکر کی بہار　　اس کے لشکر کا ہے علمبردار

اس سے باغی اگر ذرا پائیں　　لوگ پونڈے کا پوست کھچوائیں

اس کے دربار میں ہے پیوستہ | حاضر اک پانو سے کمر بستہ
اس نے شاید عتاب فرمایا | یوں جو کولھو میں اس کو پلوایا
ہے یہ شیریں کہیں نمک سے زیاد | شور ہے اس کا تا ملیح آباد
ممتبع شہد اس کا جام ہوا | بمبئ کا اسی سے نام ہوا
دی ہے مولا نے اس کو گلشن میں | پرورش انبیا کے دامن میں
ہے یہ شیریں درختِ باغ ارم | برگ پوشی ہے جامۂ آدم
اس صفا پروری کی پہنچی خاک | قندِ مصری ہے پُر خس و خاشاک
اس کا رس بات بات میں کہیے | شاخ کیا ہے نبات میں کہیے
لعلِ معشوق کے پڑے لالے | اس پہ ٹوٹے جو چوسنے والے
کوہکن قاش اس کی جب چوسے | تانہ شیریں کی پھر زباں چوسے
آم اگر کام میں ہو شکر ریز | نام شکر کا پھر نہ لے پرویز
خواہشیں اس کی راہ تکتی ہیں | شہد پر مکھیاں بھنکتی ہیں
سرخ ہے شوخ ارغوانی پوش | زرد معشوق، زعفرانی پوش
رنگ دلکش ہے اس کی زردی کا | زعفراں پر ہنسی نہیں بے جا
کیوں نہ ہو اس کا شور تا عیوق | ہے یہ ہمرنگِ عاشق و معشوق
کان میں جھک کے کہہ رہی ہے ڈال | جتنے اس رنگ کے ملیں انھیں پال
پھونس میں اس کا رنگ شعلہ فروش | اس کو کہتے ہیں آتشِ جس نوش
کیوں نہ رنگولہ زیں ہو اس کی ڈال | ہے یہ ہر میوے کا گرو گھنٹال
ہے چمن میں یہی بلند نشاں | نہ کہو شہد کو رفیع الشاں
اس کی سیوہ بہار کا شیوہ | اس سے بہتر نہیں کوئی میوہ
لقمہ ایسا کوئی بنا دیجے | کہ اگل دیجے اور نگل لیجے
اس سے شیریں جہاں میں کون مگر | ہے بیاں کا کلام شیریں تر

نظم میں رس ہے ابرِ تر کا شکریہ ہے جوابِ شکر کا

اے بیاں! طولِ داستاں ہے فضول

ہو یہ سرکارِ نادری میں قبول

﴿۲﴾

جرمانۂ آفتاب

بندگی اس جلوۂ جاوید کو جس نے بنایا مہہ و خورشید کو

اس کی تجلّی کے عجب بھید ہیں شمس و قمر سقف میں دو چھید ہیں

کیا تری قدرت کا طلسمات ہے رات کبھی دن، کبھی دن رات ہے

نور ہے، آفاقِ زمن میں ترا شور ہے، مرغانِ چمن میں ترا

زمزمے ہیں سب تری تکبیر کے قہقہے ہیں سب تری تنویر کے

تیری جھلک ناصیۂ گل میں ہے تیری پھڑک سینۂ بلبل میں ہے

نور و نظر بخشنے والا ہے تو سارے اندھیروں کا اجالا ہے تو

چرخ کے تاروں میں چمکتا ہے تو دشت کے ذروں میں دمکتا ہے تو

نور ترا، پاس نہیں دور ہے دور نہیں، پاس ترا نور ہے

واہمہ دوڑائے گا توسن کہاں عرش کہاں اور رگِ گردن کہاں

کوئی نہیں تیرا نظیر و شبیہ

ایک تری ذات ہے لاریب فیہ

﴿نعت افتخارِ دنیا و دیں چراغ آسمان و زمیں حضرت خاتم المرسلینؐ﴾

اس مدنی نور کی کیا بات ہے آئینۂ نورِ سمٰوات ہے

خاک صفی کا نہ اٹھا تھا خمیر کاخِ نبوت میں وہ تھا جائے گیر

اس کی تجلی سے یہ چمکا عرب
آج اسی سمت کو جھکتے ہیں سب

اس کی خدا گرنہ الٹتا نقاب
ہوتے اندھیرے میں مہہ و آفتاب

اس کی بشارت کے ہیں عیسیٰ خطیب
اس کی سواری کے ہیں موسیٰ نقیب

اوج پہ وہ بدرِ کمال آگیا
سارے ستاروں پہ زوال آگیا

مسندِ ارشاد پہ رکھا قدم
پچھلے قوانین پہ پھیرا قلم

رعب سے تھرانے لگے روم و رے
ہلنے لگی کرسیِ کسرا و کے

ہنسنے لگے طاقِ حرم کے چراغ
رہ گئے خاموش، عجم کے چراغ

ماہ کی جانب جو اشارہ کیا
ایک اشارہ سے دوپارہ کیا

بعد نبی جلوہ فشاں ہیں امام
مہرِ پیمبر، تو وہ ماہِ تمام

فرض خرد دونوں کی تعظیم ہے
ان کو سلام اور انھیں تسلیم ہے

نفیِ غیر کا تقاضا، جلوۂ ذات کی تمنا، پردۂ ماسوا کا لقب، لمعۂ توحید کی طلب

نور ہے تو نور ہے تو، اے خدا
نور سے رکھ پردۂ ظلمت جدا

شش حدِ امکاں میں اک اندھیر ہے
صبحدمِ حشر میں کیا دیر ہے

کرتی ہے اب کام، جہاں تک نگاہ
ظلمتِ عصیاں سے ہے عالم سیاہ

باصرہ اندھیر سے گھبرا گیا
نیّرِ اسلام پہ ابر آگیا

سکہ بٹھا احمدِ محمود کا
پردہ اٹھا، مہدیِ موعود کا

کرتے ہیں پتھر کے صنم سامنا
کعبۂ اسلام کے تھم، تھامنا

خاک اڑا گنبدِ افلاک تک
گنبدِ افلاک زمیں پر پٹک

شمس و قمر کا کرہ چکرا کے توڑ
ایک کو بس ایک سے ٹکرا کے توڑ

تیرگیِ شام کی چوٹی کتر
شورِ سحرگاہ کا دم بند کر

شائبۂ غیر کو کھو دے کہیں — جھوٹے ستاروں کو ڈبو دے کہیں

ساغرِ خورشید کو واژوں گرا — حمکدۂ گنبدِ گردوں گرا

کہہ کہ کرے زلزلۂ باد و آب — بدعت واحداث کی مٹی خراب

ایک دو اشجار ہیں بیخِ فساد — ان پہ گرا حادثۂ برق و باد

جلنے لگے بحر کا دامانِ تر — ہلنے لگے کوہِ گراں کی کمر

پردۂ غفلت ہے جہاں کا طلسم — ٹوٹے کہیں گنجِ نہاں کا طلسم

بس کوئی شامی نہ عراقی رہے
تیرے سوا ایک نہ باقی رہے

﴾آفتاب کی طرف خطاب اور آفتاب پرستی کا عتاب﴿

اے حیرانِ ازل اے آفتاب! — کیوں ہے تو آوارۂ دیرِ خراب

دائرۂ دہر میں چلتا ہے تو — نائرۂ قہر میں جلتا ہے تو

سر ہے ترا گردشِ تقدیر میں — حلق ترا طوقِ گلو گیر میں

قلب ترا کیوں خفقانی کیا؟ — چہرہ ترا کیوں یرقانی کیا؟

دکھ ترے پیکر کو برا لگ گیا — روز کی گردش کا کرا لگ گیا

صبح ازل کیوں تجھے بھولی ہے کیوں؟ — آنکھ میں سرسوں تری پھولی ہے کیوں؟

وادیِ امکاں میں بھٹکتا ہے تو — گنبدِ گرداں میں لٹکتا ہے تو

تیری گلوگیر گلو ہے رسن — جانتی ہے چشم غلط بیں کرن

سر میں ترے درد ہے کیوں، کہہ تو دے — رنگ ترا زرد ہے کیوں کہہ تو دے

رات کو کیوں رہتے ہیں تیور بجھے — دن کو چڑھی رہتی ہے کیوں تپ تجھے

کس نے ترے مغز کو چکرا دیا — قلعۂ کہسار سے ٹکرا دیا

نیلے سمندر میں گراتے ہیں کیوں — بھول بھلیاں میں پھراتے ہیں کیوں

صورت زورق تہہ و بالا کیا — کون ڈبویا اور اچھالا کیا

دیتے ہیں تشبیہ کہاں سے کہاں — روز لئے پھرتے ہیں کیوں موکشاں

سر کو ترے قطع کیا بے دریغ — لائے تھے کیوں تیرے لیے طشت و تیغ

بات نہ پوچھی تری کیا بات کیوں — جلنے لگا آگ میں دن رات کیوں

دشت میں تیرا کوئی ساتھی نہیں — چھاؤں میسر تجھے آتی نہیں

دھوپ میں دو پہر کو چلتا ہے کیوں — سایہ ترے سایہ سے جلتا ہے کیوں

گرم روِ عالم ایجاد ہے — بے وطن و بیکس و بے زاد ہے

کوچ کیا گردِ زمان و زمیں — اور نہ ملی منزلِ راحت کہیں

آنکھ اٹھاتا نہیں لیل و نہار — کہہ تو سہی کاہے سے ہے شرمسار

گو بہت اونچی تری خرگاہ ہے — بندہ درِ ذرۂ درگاہ ہے

تاج دہِ تارکِ افلاک ہے — کس لیے جاروب کشِ خاک ہے

کہہ لبِ اظہار سے، اے آفتاب!
ہے ترے طالع میں کہاں کا عتاب؟

آفتاب کا جواب اور گردشِ تقدیر کے اسباب

میں نے کیا مہر سے جب یہ خطاب — مجھ کو دیا مہر نے تب یہ جواب

ہوں میں بلا دیدۂ جرمِ عوام — رکھتے ہیں اک جرم پہ سو اتہام

کوئی حقیقت سے نہیں بہرہ یاب — ذرہ ہوں میں جانتے ہیں آفتاب

کہنہ گرفتار، خیالاتِ خام — دہر میں کیا کیا مجھے رکھتے ہیں نام

کہتے ہیں کجروِ انجم مجھے — بادشہِ چرخِ چہارم مجھے

چشمۂ تہ جوش ہوں انوار کا — آئینہ ہوں جوہرِ آثار کا

ترک سوارِ فلکِ پیر ہوں — کارکنِ کشورِ تدبیر ہوں

دیدہ کشائے عسسِ شام ہوں ۔۔۔ دودہ زدائے رخِ ایام ہوں
میں نے چمن کو صنمِ چیں کیا ۔۔۔ سندسِ اشجار کو رنگیں کیا
ہاتھ میں ہے بوتۂ اکسیر گر ۔۔۔ کان کے کونے میں بناتا ہوں زر
کی ہے رگِ سنگ میں تولیدِ خوں ۔۔۔ لعل کو دی صورتِ یاقوت گوں
مجھ سے مطرا رخِ افلاک ہے ۔۔۔ مجھ سے مطلا کرۂ خاک ہے
جملہ گہر ہیں، مرے لختِ جگر ۔۔۔ جملہ ثمر ہیں، مرے نورِ نظر
میری تفِ قہر سے ڈرتے ہیں سب ۔۔۔ شبنم و سیماب ٹھہرتے ہیں کب
مجھ سے چمکتی ہے مغاں کی شراب ۔۔۔ مجھ سے جھلکتا ہے جہاں کا سراب
شرق سے تا غرب ہے میرا گزر ۔۔۔ عرش سے تا فرش ہوں میں جلوہ گر
صیرفیِ دولتِ اقلیم ہوں ۔۔۔ صیقلیِ چہرۂ تقویم ہوں
ناوٗ نباتات کی کھیتا ہوں میں ۔۔۔ رنگ، جمادات کو دیتا ہوں میں
آگ نہ رخسار گر اپنا جلائے ۔۔۔ کون ثمر کس کو پکا کر کھلائے
گلشنِ ایجاد ہے زیرِ عمل ۔۔۔ پھولتے پھلتے ہیں سبھی پھول پھل
پارسیوں کا ہوں مقدس خدا ۔۔۔ برہمنوں کا ہوں مہا دیوتا

منھ پہ کہوں پھر مجھے کس کا حجاب
ذرہ ہوں میں جانتے ہیں آفتاب

آفتاب کا اظہار اپنی فروتنی کا اقرار

اتنی کہاں مجھ کو خبر ہوتی ہے ۔۔۔ رات کدھر صبح کدھر ہوتی ہے
رنگ ہوں میں رنگ چھڑاتا ہے اور ۔۔۔ آگ ہوں میں آگ جلاتا ہے اور
مجھ سے فروزاں ہے کہاں باغ وراغ ۔۔۔ ہے مری قندیل میں قدرت چراغ
دور سے جل مجھ کو چڑھاتے ہیں لوگ ۔۔۔ چشمہ ہوں میں تشنہ بناتے ہیں لوگ

زرد کبھی ہوں میں، کبھی سرخ فام　　رنگ بدلتا ہے مرا صبح و شام

داغِ جبیں سے ہوئی حاصل نمود　　مجھ سے کبھی ترک نہ ہوگا سجود

گھیرتے ہیں مجھ کو تو گھرتا ہوں میں　　پھیرتے ہیں مجھ کو تو پھرتا ہوں میں

جلتی ہے خاطر جہلا کے لیے　　کوئی کہے ان سے خدا کے لیے

ذرہ کجا، نیرِ اعظم کجا　　بھول گئے قولِ براہیم کیا

فخر سے گردن کو کیا تھا بلند　　پڑ گئی لِمـااَفُلَتْ کی کمند

شیشۂ ادراک جو ہے چور چور　　چشمۂ انصاف سے ہیں دور دور

تنگ نظر شکل صفت مور ہو
کور ہو تم، کور ہو تم، کور ہو

﴿ایک ہندو کی کہانی اور آفتاب پرتیز زبانی﴾

تھا کوئی ہندو چمنِ ناز میں　　اس کو صبا لے گئی شیراز میں

تاکہ اتر جائے سفر کا تکان　　شہر میں اترا کہیں لے کر مکان

نورِ حقیقی کا نہ لیتا تھا نام　　تھا اسے خورشید پرستی سے کام

پردۂ چشمِ دل و دیں پارہ تھا　　وادیِ تاریک میں آوارہ تھا

عقل تھی سورج کی طرح پھیر میں　　دیر سے تھا جہل کے اندھیر میں

اتنے میں دکھ درد کی مورت ہوا　　نرگسِ بیمار کی صورت ہوا

شہر وہ اسلام کا محکوم تھا　　اور وہ اسلام سے محروم تھا

گریہ وزاری میں گزرتی تھی رات　　پوچھنے آتا نہ کوئی اس کی بات

دکھ میں کیا کرتا تھا فریاد بس　　کوئی نہ تھا شہر میں فریاد رس

کہتا تھا پردیس کے پالے پڑے　　تن کے سبب جان کے لالے پڑے

تار بچھونے کا بدن بن گیا　　بلکہ بچھونے کی شکن بن گیا

بیکسیوں کا نہ گیا دکھ سہا
ایک مسلماں کو بلا کر کہا
عرض کیا بندۂ کافر ہوں میں
دیس سے بچھڑا ہوں مسافر ہوں میں
بے وطن و بے دل و بیمار ہوں
بیکس و بے یاور و بے یار ہوں
لعل و جواہر نہ طلا چاہیے
دردِ غریبی کی دوا چاہیے
تم کو خبر تک نہیں ہوتی ہے بس
شمعِ سحر تک مجھے روتی ہے بس
رسمِ وفا دہر سے کیا اٹھ گئی
ساحتِ شیراز سے کیا اٹھ گئی
نیک نہاد آپ میں کوئی نہیں
یا کوئی پابند نکوئی نہیں
دیتے نہیں راحتِ آوارگاں
کرتے نہیں چارۂ بے چارگاں
شرط نکوئی میں گر اسلام ہے
مذہب اسلام کا بس نام ہے
حصر گر ایماں پہ ہے تائید کا
رنگِ تعب میں کیا تقلید کا
رسم بزرگانِ طریقت ہے کیا
مہرِ مروت کی حقیقت ہے کیا
موجِ کرم غرب سے تا شرق ہو
کافر و مومن میں نہ کچھ فرق ہو

کلکِ زباں واں کی زبانی کہوں
سنئے میں قاضی کی کہانی کہوں

﴿ قاضیِ اسلام کی حکایت اور اہلِ اسلام کی شکایت ﴾

نصب تھا قاضی کوئی بغداد میں
نام تھا اس کا دہشِ داد میں
تھا چمنِ جود و کرم کا سحاب
آن کے اک گبر نے مانگی شراب
سنتے ہی قاضی اسے جھنجلا گیا
شکلِ خمِ مئے اُسے جوش آگیا
اس سے لگا کہنے کہ اے بے شعور
گبر ہے تو مئے تجھے دوں گا ضرور
گبر نے کی عرض کہ اے دیں پناہ
آپ کہاتے ہیں سخی واہ واہ
میں نے اگر آپ سے مانگی شراب
مجھ پہ نہ فرمایئے حضرت عتاب

جس نے سخی نام رکھا آپ کا — سچ تو یہ ہے کام کیا پاپ کا
شیوۂ ایثار میں، اے حیلہ ساز! — کافر و دیندار میں کیا امتیاز
مومن و کافر پہ ہے لطفِ عمیم — ذات ہے اللہ کی سچ مچ کریم

طالبِ مَے ہوں کہ طلبگار آب
دے نہ سخی چاہیے سوکھا جواب

مطلب کی طرف بازگشت اور ہندو کی سرگذشت

ہندوِ مسکیں نے کہی جب یہ بات — مومنِ غمگیں نے کیا التفات
رو کے کہا زر کہ دوا چاہیے — بھائی بتا دے تجھے کیا چاہیے
کہنے لگا بے وطن و بے دیار — چاہیے بیمار کو بیمار دار
تو نے اگر میرا مداوا کیا — اور مجھے اللہ نے اچھا کیا
نام نہ لوں گا کبھی اصنام کا — کلمہ پڑھوں گا ترے اسلام کا
چھوٹ گیا تن اگر آزار سے — رشتہ نہ رکھوں گا میں زنار سے
خرمنِ خورشید جلا دوں گا سن — بلکہ کروں وید کو گنگا کا پن
فدیۂ ایمان کروں گا ضرور — گائے کو قربان کروں گا ضرور
پختگیاں ہوگئیں اس بات کی — خوب مسلماں نے مدارات کی
ہندوئے بیمار شفا پا گیا — بندۂ دیندار جزا پا گیا
ابر عنایت نے لیا گھیر اسے — غسلِ شفا میں نہ لگی دیر اسے
شافیِ علام نے اچھا کیا — وعدۂ اسلام کو پورا کیا
شرک سے نیت کو معرّا کیا — بتکدہ و بت پہ تبرا کیا

شرم سے خور منھ کو چھپانے لگا
منھ پہ وہ خورشید کے آنے لگا

آفتاب کی فضیحت اور آفتاب پرستوں کو نصیحت

نام ترا مہر ہے، اے آفتاب! — جھوٹ کہ بے مہر ہے، اے آفتاب!
میں نے کہاں تیری عبادت نہ کی — تو نے کبھی میری عیادت نہ کی
میں نے کہاں تیری پرستش نہ کی — تو نے پرستار کی پرسش نہ کی
چشمہ ترا گر نہیں موجِ سراب — تشنہ لبوں کو کبھی دیتا ہے آب
میں نے کس ارمان سے پوجا تجھے — تو نے کبھی آن کے پوچھا مجھے
قمقمۂ عرشِ بریں تو نہیں — نور سماوات و زمیں تو نہیں
ایک شرارہ ہے سو پادرہوا — نیر اعظم کہیں اندھے تو کیا
بخت لڑے کیا ترے انوار کا — گھر ہے تجلی تری تکرار کا
دور ہے کوسوں ترے طالع سے نور — ناز ہے کیا کس لیے کھینچا ہے دور
پھیل گیا نیل غروب و کسوف — منھ نہ دکھا منھ نہ دکھا بے وقوف
فاش نہ ہو شعبدۂ دیو تا — غاشیہ کش تیرے کہیں دیوتا
دو حیواں تھے ترے پالے پڑے — دونوں کی بینائی کے لالے پڑے
دن کو خراب ایک تو شب بھر ہے ایک — شپرہ چشم ایک تو شپّر ہے ایک
دو ترے دشمن ہیں گہن اور گھٹا — شان تری دیتے ہیں دونوں گھٹا
ابخرۂ خاک سے تو مات ہے — خاک بڑی تیری کرامات ہے
آپ کو ہم پایۂ عیسیٰ کیا — ہم سے مریضوں کو نہ اچھا کیا
تیری اطاعت مجھے منظور ہو — دور ہو آگے سے مرے دور ہو
کہہ کے یہ بیچارہ فنا ہوگیا — نورِ حقیقی پہ فدا ہوگیا

تھا صفتِ ماہ منور تمام

خاتمہ باالخیر ہوا و السلام

﴿ کتاب کا خاتمہ ﴾

روک بیاں خامۂ جادو بیاں | آج ہے تو طوطیِ ہندوستاں
قدر گھٹی قحطِ خریدار سے | اٹھ گئے گاہک صفِ بازار سے
نوبتِ فریاد و فغاں آگئی | باغِ فصاحت میں خزاں آگئی
کترے ہوئے گل کوئی چنتا نہیں | نالۂ بلبل کوئی سنتا نہیں
صورتِ کلکِ دو زباں سر جھکا | شکر کہ اس نظم کا قصہ چکا
ہے یہ سب الطافِ سخن آفریں | تجھ کو لگا کہنے سخن آفریں
لاکھ نئے کلک نے نالے کئے | تو نے ورق سیکڑوں کالے کئے
دے گی ضرور اس کی عنایت پناہ | ورنہ کہاں جائیں گے لے کر گناہ
زور گیا گر یہ و زاری ہے اب | رحمتِ باری تری باری ہے اب
چلتی رہے بادِ بہارِ قبول | کچھ نہ باسی مرے گلشن کے پھول

ہوں نہ تہی گنبدِ گردونِ دوں
نالہ رہے میں نہ رہوں یا رہوں

تضمینات

﴿۱﴾

تضمین بر غزل عظیمائے نیشاپوری

کس چہ داند حسن با عشقِ بلا پرور چہ گفت
با نیازِ عاشقاں نازِ بتِ خود سر چہ گفت
قصۂ من گوش کن کاں شوخِ غارتگر چہ گفت
قاصد آمد گفتمش آں ماہِ سیمیں بر چہ گفت
گفت با ہجرم بسازد گفتمش دیگر چہ گفت

بولا قاصد غم سے گر ہونے لگے حالت زبوں
صبر ہاتھوں سے نہ دے میں نے کہا پھر کیا کروں
ضبطِ غم سے پاؤں پھیلائے اگر جوشِ جنوں
گفت دیگر با زجدِ خویش نگذارد بروں
گفتمش جمع است از پا خاطرم از سر چہ گفت

سر کو وہ کہنے لگا کر دے مرے در کے سپرد
خواہ سر ہو ریز ریز اور خواہ تن ہو خورد و مرد
میں نے پوچھا کیا سبب کیوں سر پراتنی دست برد
گفت سر را بایدش از خاکِ رہ کمتر شمرد
گفتمش کمتر شمردم زیں تنِ لاغر چہ گفت

بولا قاصد سر فروشی کی تو تن بھی کر فروخت
گو وہ کردے چاک چاک اس جامۂ خاکی کی دوخت
من کہ بردم نام جسمت در دہن تیری بسوخت
گفت جسم لاغرش را از غضب خواہیم سوخت
گفتمش من سوختم در بابِ خاکستر چہ گفت

کاوش اتنی کیوں ہے قاصد نے کہا اے نامراد
راکھ جل بھن کر ہوا پھر تجھ کو کیا امید داد
سن کے خاکستر کو آندھی ہوگیا وہ شعلہ زاد
گفت خاکستر چو گردد خواہشِ برباد داد

گفتمش برباد رفتم در حقِ محشر چہ گفت

ہاں وہ کہتا ہے کہا میں نے کہ اے بے مہر و درد　　کی اڑا کر تو نے خاکستر بھی اس کی گرد برد
اور جو پہنچی عرصۂ محشر تک اڑ کر اس کی گرد　　گفت در محشر بیکدم زندہ اش خواہیم کرد
گفتمش من زندہ کردی یم زخیر و شر چہ گفت

کھلکھلا کر پھر تو قاصد نے کیا مجھ سے خطاب　　باوجودِ عشقِ صادق غافل اتنا اضطراب
خیر کس کی شر کہاں کی کیا حساب اور کیا کتاب　　گفت خیر و شر نہ باشد عاشقاں را در حساب
گفتمش ایں ہم حسابے از لب کوثر چہ گفت

بولا قاصد پڑ گئی ہے پوچھنے کی تجھ کو لت　　آبِ کوثر بھی نہیں کیا خونِ عاشق کی دیت
میں نے خود چھیڑا تھا ذکرِ کوثرِ صافی صفت　　گفت با ما بر لبِ کوثر نشیند عاقبت
گفتمش گر عاقبت ایں است زیں خوشتر چہ گفت

سن کے تکرار بیاں جھنجھلا اٹھا قاصد ندیم　　تھی مگر مستقیِ دلدار کیا جانِ دو نیم
پھر کہا کچھ اور کہہ اے چشمۂ لطفِ عمیم　　گفت دیگر بر نتابد بردلش بارِ عظیم
گفتمش دیگر بگو گفتا مگو دیگر چہ گفت

﴿۲﴾

تضمین بر غزل ناسخ لکھنوی

مرا دیدہ ہے منبع آدمِ ثانی کے طوفاں کا　　مرا پہلو ہے مشہد کشتۂ امید و ارماں کا
مرا حلقوم ہے مغرب ہلالِ تیغِ برّاں کا　　مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

بہم نا جنس جو ہیں کب وہ پیار آپس میں رکھتے ہیں　　برنگِ آدم و شیطاں غبار آپس میں رکھتے ہیں
جناں کی کاوشیں ہیں خار خار آپس میں رکھتے ہیں　　ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پُر داغ کو کیوں کر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا

لگی ہے آگ سی چاروں طرف جنگل بھبوکا ہے
شعاعِ مہر سبزہ کی طرح گوشوں سے پیدا ہے
افق کا دائرہ اے قیس اپنا دورِ صحرا ہے
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

لہو کھاتے ہیں شعلے پھانکتے ہیں جان کھوتے ہیں
مرے گل کھانے پر شبنم سے باغ و راغ روتے ہیں
شرر والے زمینِ دل میں کیا کیا بیج بوتے ہیں
شگفتہ مثلِ گل ہر فصلِ گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا

حریرِ آسماں قامت پہ میرے تنگ آیا ہے
سما میں کیا سماؤں لعل تاجِ عرش پایا ہے
قیامت اس کا قامت مہرِ محشر اس کا سایا ہے
وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

الٰہی کس نے بے دردی خمِ افلاک میں بھر دی
شبِ غم گر کسی عاشق کے منہ پر چھا گئی زردی
سحر کہتا ہے اس کو اک زمانہ ہائے نامردی
شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بیدردی
فلک کو گر بگولہ جالگا خاکِ شہیداں کا

سنا کر گل کو بلبل نے کہا ایامِ باراں میں
کسی گل پیرہن کا وصل ہو فصلِ بہاراں میں
پکاری شمع رو رو کر یہ بزمِ غمگساراں میں
چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

میں اس عالم میں کیا تھا کیا برا ہوں کنجِ مرقد میں
کیا نقلِ مکاں تو کیا بھلا ہوں کنجِ مرقد میں
وہی دکھ وہ ہی حیرت لے گیا ہوں کنجِ مرقد میں
کفن کی جب سپیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

کمیں سے ناوک افگن تھا سرِ میدانِ نیکوئی
چھپاتے بیمِ رسوائی سے کل دکھ دردِ جاں کھوئی
بھرے کس طرح ٹانکا کیا کرے جراح دلجوئی
نظر آتا نہیں مرہم لگائے کس طرح کوئی
دہانِ یار گویا منہ ہے میرے زخمِ پنہاں کا

بٹھایا طاقِ افریدوں نے یادِ طاقِ ابرو نے
چکھایا ساغرِ جمشید اس کے لعلِ خوشبو نے

موئی پر پائے کیا معراج اس مورِ سر کو نے — دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے

گماں تھا تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

کسی دامن سے گو کوتاہ ہے دستِ طلب اپنا — دکھائے پاٹ دامن کا عبث ماتم کی شب اپنا

فرشتے کل تماشہ دیکھتے تھے سب کے سب اپنا — جنوں نے ہجر کی شب ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا

کیا ہے چاک تا جیب سحرا اپنے بیاباں کا

کبھی ہم بھی تھے گلزارِ جہاں میں اے گلِ احمر — کہیں کیا ماجرائے چشم و روداد رخِ اصغر

فروغِ عارضی سے بھی بدل جاتا ہے کیں پرور — جو سرخی آتی ہے عکسِ شفق سے بھی مرے منہ پر

حسد سے رنگ ہوتا ہے مبدّل چرخِ گرداں کا

پناہِ تاج و گاہِ کشورِ معنیٰ سمجھتے ہیں — دوات اک کوسِ شاہی ہے قلم ڈنکا سمجھتے ہیں

درِ درگاہِ دل پر شیر کا پھیرا سمجھتے ہیں — صریرِ کلک کو اب شیر کا نعرا سمجھتے ہیں

یقیں اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستاں کا

مسافر تھا میں وحدت کا سدا کثرت سے گھبرایا — نہ عیسیٰ کا ہوا ہمدم نہ میں سورج کا ہمسایا

کفِ گلچیں مرے گل کے گریباں تک نہیں آیا — کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا

نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے گریباں کا

بیاں سر حلقۂ عشاق تھا قلاش تھا ناسخ — سزائے آفریں شائستۂ شاباش تھا ناسخ

خیالِ ابروئے بت میں زبس ہشاش تھا ناسخ — تہہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ

کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

﴿۳﴾
تضمین بر غزلِ خود

بات پھوٹی ہے چمن میں مرے مرجھانے کی — اڑی پرنوں کی طرح پرزوں کے اڑوانے کی

عرقِ شرم سے لکھی نہیں دھو جانے کی — تہمتِ قتل مٹانے سے نہیں جانے کی

خونِ ناحق مرا سرخی ہے ہر افسانے کی

نہ ہوئیں شربتِ دیدار سے آنکھیں سیراب　　سامنے آن کے بیٹھے بھی تو اٹھا نہ حجاب
زلفیں دلاّلِ صبا نے جو اٹھا دیں تو شتاب　　جلوہ سے ڈال دیا چشمِ تماشا پہ نقاب
یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی

تم تو وہ شعلۂ سوزاں ہو کہ کیا ہوئیگی شمع　　ہاتھ پروانے سے کیا گریہ سے منہ دھوئیگی شمع
سوگ بے سود ہے کیا پائیگی، جاں کھوئیگی شمع　　اب مجھے کھو کے نہ روؤ کہ اگر روئیگی شمع
جان پڑ جائیگی کیا راکھ میں پروانے کی

یم میں طوفان چلے آتے ہیں کیا جوشیدہ　　ابھی جاری ہے کوئی دیدۂ محنت دیدہ
کیوں کہیں کوہکن و قیس گئے رنجیدہ　　آندھیاں آتی ہیں ہر سال کوئی شوریدہ
خاک اڑاتا ہے ابھی تک کسی ویرانے کی

نعمتیں کھائیں مگر غم کے سوا کچھ نہ بچا　　تن بدن آتشِ سوزاں نے جلا خاک کیا
ہائے کس سوختہ ساماں کا میں مہمان ہوا　　ہڈیاں راکھ میں ڈھونڈے نہ ملیں تجھ کو ہما
شکوہ مت کیجو کہ خو تھی مجھے غم کھانے کی

نعشِ عشاق پہ گزری ہے قیامت مت پوچھ　　تجھ کو نے سوگ، نہ سوزش، نہ ندامت مت پوچھ
سارے معشوقوں سے الٹی ہے تری مت مت پوچھ　　اثرِ سوزشِ تاثیرِ محبت مت پوچھ
ہوگئی شمع ستی آگ میں پروانے کی

گوش زد شورشِ مستانِ محبت ہے کہاں　　دیکھ تو تلخیِ صہبا کی سی لذّت ہے کہاں
وقت ہاتھوں سے نہ کھو عیش کو مہلت ہے کہاں　　واعظا نوش بھی کر شورِ قیامت ہے کہاں
ہے یہ آواز کسی مست کے بڑّانے کی

کیا برا کرتے ہیں کیوں آٹھ پہر ہے واعظ　　بُت پرستی پہ ہماری تو نظر ہے واعظ
اپنے اللہ کے گھر کی بھی خبر ہے واعظ　　سنگِ اسود ہے حرم میں، مجھے ڈر ہے واعظ
کہیں پڑجائے نہ بنیاد صنم خانے کی

تر زباں فیضِ الٰہی کی بدولت تھا میں   نقشِ رنگینیٔ صنعِ یدِ قدرت تھا میں
قدس میں مرغِ شب آہنگِ حقیقت تھا میں   چمنِ دہر میں اک باغِ فصاحت تھا میں
لیکن اے چرخ نہ تھی فصل ابھی مرجھانے کی

آ گیا وقت بلا لے گئی اچھوں کو فنا   نیکیاں پردہ نشیں عیب ہوئے جلوہ نما
تو نے دیکھا ہے زمانہ مجھے تحقیق بتا   اے بیاں صفحۂ ہستی سے اٹھے نیک دیا
مجھ ہی بدبخت سے کوئی نہیں کرتا نیکی

(ماہنامہ مخزن، لاہور، اپریل ۱۹۰۸ء)

﴿۴﴾

تضمین بر غزل مرزا غالب

پھرکی ہے کہ ہے گنبدِ مینا مرے آگے   نیرنگِ مہہ و مہر ہے کیا کیا مرے آگے
وہ مہرۂ بازیچہ ہیں گویا مرے آگے   بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اِک بلبلہ ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک   اک لہر ہے انگیزشِ امکاں مرے نزدیک
اک سحر ہے نیرنگِ بہاراں مرے نزدیک   اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز باد نہیں کوکبۂ جم مجھے منظور   جز سایہ نہیں نیرِّ اعظم مجھے منظور
جز گرد نہیں گردۂ آدم مجھے منظور   جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

کھولے ہے کمر کوہِ قوی پا مرے ہوتے   سر نخل سے ٹکرائے ہے نکما مرے ہوتے
کچھ قیس ہی پنہاں نہیں ہوتا مرے ہوتے   ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

آوارہ ہوں گردِ قدم آسا ترے پیچھے ہر رنگِ سرِ زلف ہے سودا ترے پیچھے

کیا کہیے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

طوطی کی روش زمزمہ پیرا ہوں نہ کیوں ہوں مشہود بھی، شاہد بھی ہوں اچھا ہوں نہ کیوں ہوں

سرتا بقدم دیدۂ بینا ہوں نہ کیوں ہوں سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں

بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

کیا سرو جبیں، سرمہ، گلو دیکھتے ہیں یار شیشے میں پری ہو تو پریخواں ہو نمودار

آگے ہو گلِ سرخ تو بلبل ہو گہر بار پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

مسجد سے سوئے دیر لو کھینچے ہے مجھے کفر کھنچتا تھا بہت دور سو کھینچے ہے مجھے کفر

زاہد مجھے ٹوکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عالم میں سلیمان پری کش ہے مرا نام میرے لیے آوارہ ہوئے کعبہ سے اصنام

بلبل مرے گل دام میں، ہیں لاکھ گل اندام عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام

مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

کھا بازیِ ایامِ مقرر نہیں جاتے عیشِ غلط انداز کے اوپر نہیں جاتے

اربابِ سکوں آپ سے باہر نہیں جاتے خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے

آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

جاں دینی بدیدارِ قدح سنتِ جم ہے کچھ ہو نفسِ باز پسیں وقتِ کرم ہے

اے تم کو مرے وسعتِ مشرب کی قسم ہے گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

زنہار بیاں ہم تگ وہم تاز ہے میرا　　منجملۂ یارانِ ہم انداز ہے میرا
ہم مکتب و ہم رنگ وہم آواز ہے میرا　　ہم پیشہ وہم مشرب وہم راز ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

﴿۵﴾

تضمین بر غزل حکیم مولا بخش قلق میرٹھی

ہاں مری وحشت کا قصہ کو بکو افسانہ تھا　　سر بسر ویرانۂ مجنوں مرا کا شانہ تھا
رنج تھا، دکھ تھا، جنوں تھا، سوگ تھا، غم خانہ تھا　　شب سرِ شوریدہ، بالیں پر مرا اک جانہ تھا

دل میں تھا اک جوش، لب پر نعرۂ مستانہ تھا

چار سوئے تن سے جنسِ خوش دلی نایاب تھی　　عقل سرمستِ خیالِ حسنِ عالمتاب تھی
چشمِ وامانده کسی کی یاد میں بے خواب تھی　　جاں کسی کی زلف میں پابندِ پیچ و تاب تھی

دل کسی کی چشمِ غارت گر سے ہم پیمانہ تھا

ہل گئے ٹانکے رفو چاکِ رفوئے جیب تھے　　اشک رنگِ آستین و آبروئے جیب تھے
خار سینے سے نکل کر دوبدوئے جیب تھے　　پاؤں صحرا کی طرف تھے ہاتھ سوئے جیب تھے

نالہ سینے سے لبوں تک آتے ہی بیگانہ تھا

شحنۂ غم کی روش بھر بھر کے آئے کینہ میں　　سکۂ داغِ جنوں تھے سینہ کے گنجینہ میں
حیرتِ وامانده منہ تکنے لگی آئینہ میں　　حسرتِ خوابیدہ کیا کیا چونکتی تھی سینہ میں

دل میں جوں جوں شورِ افغاں ہائے بیتابانہ تھا

تھا کفِ سیلاب گردوں گریۂ سیال سے　　تنگ تھا کیا کیا نفس نالہ کے استعمال سے
دیکھ سکتا تھا کوئی اس رنج و اضمحلال سے　　عاقبت کی چشم پوشی، چشم نے اس حال سے

اور غفلت یہ ہوئی طاری کہ ہوش اصلانہ تھا

گھٹ گئی تھی روح، نکلی چھوڑ زندانِ بدن　　گاہ دشتِ قیس دیکھا، گاہ کوہِ کوہکن
بھر گیا جب سیر دشت و کوہ سے جی ہم سخن　　لے اڑی پھر دشت گردی خواب میں سوئے چمن
اور چمن بھی وہ کہ آزادوں کا دام و دانہ تھا

باغِ ہستی میں نہ ہوگا مجھ سا کوئی نا سمجھ　　صحنِ گلشن میں در آیا بزم یارانا سمجھ
گوشِ گل نے کچھ سنی میری نہ دیوانا سمجھ　　چشمِ نرگس نے نہ دیکھا مجھ کو بیگانا سمجھ
حق بجانب ہے کہ واں پر سبزہ تک بیگانہ تھا

لالہ بھی جلتا تھا میرا داغِ سوزاں دیکھ کر　　نوک کی لیتا تھا کانٹا تن کو عریاں دیکھ کر
اوس بھی دیتی تھی چھینٹے مجھ کو گریاں دیکھ کر　　گل بھی ہنستا تھا مرا چاکِ گریباں دیکھ کر
زیرِ لب سوسن کے بھی کچھ اپنا ہی افسانہ تھا

زہر لگتا تھا میں سبزہ کو کہ گل چیں آ گیا　　ابر ایسا دیکھ کر برسا کہ مجھ پر چھا گیا
کچھ بنفشہ بھی خمیدہ جان کر شرما گیا　　بیدِ مجنوں مجھ کو تنہا دیکھ کر تھرا گیا
مو پریشانی پہ سنبل بھی مرے دیوانہ تھا

نشۂ رنگِ چمن سے نخل تھے مستی کناں　　زاہدوں کے دل میں غنچے لے رہے تھے چٹکیاں
قصہ کوتہ، کیا چمن تھا، کیا سمن تھی، کیا سماں　　کرتے کرتے سیر جب آگے بڑھا دیکھا وہاں
شکل میں عشرت کدہ کی ایک عبرت خانہ تھا

اور کچھ تھی اور کچھ تھی، وہ زمین و آسماں　　دیکھتا تھا سحر کا ساماں، سحر کا سا سماں
سیر سے برسوں نہ ہوتے سیر لیکن اے بیاں　　کرتے کرتے سیر جب آگے بڑھا دیکھا وہاں
شکل میں عشرت کدہ کی ایک عبرت خانہ تھا

کچھ قفس تھے اک طرف کچھ جانور طاؤس دُم　　ایک طرف لحنِ مغنی قدسیوں کے ہوش گم
اک طرف حالت میں صوفی جھومتے تھے کلہم　　اک طرف مے اڑ رہی تھی واں ہزاروں خم کے خم
کوئی بیخود، کوئی بیتاب اور کوئی مستانہ تھا

عشق در گل، سوز در دل، سرشارِ زخم کیں　　　شعلہ دردم، دیدہ پرنم، خوں بہار سرزمیں
شیشہ در بر تیشہ برسرتن فگار نازنیں　　　نغمہ برلب، جان برکف، دل نگارِ آستیں
سب محبت کیش تھے کیا حلقۂ رندانہ تھا

شمع و پروانہ کو چمکاتا تھا کوئی شعلہ خو　　　کچھ گلوں کو چھیڑتے تھے بلبلوں کے روبرو
قصہ کوتہ عاشقوں کا کنج تھا اک سمت کو　　　اور اک جانب کو حلقہ زن تھے چندیں شمع رو
مہر جن کے سامنے خاکسترِ پروانہ تھا

جس طرف ابرو چڑھے خوں ریز لشکر ہوگیا　　　جس طرف زلفیں بڑھیں اسلام مضطر ہوگیا
جس طرف کو منہ کیا خورشید ششدر ہوگیا　　　جس طرف بھی ہنس دیا میدانِ محشر ہوگیا
اٹھ گئیں نظریں جدھر یک لخت سب ویرانہ تھا

ان کی افشانِ جبیں سے تھا ستاروں کو شرف　　　چاندنی چٹکی تھی زیرِ عارضانِ بے کلف
صحن میں بیٹھے تھے جتنے مہر طلعت صف بصف　　　ان میں سے اک شمع رو اٹھ کر بڑھا میری طرف
زلف تھی رخ پر پریشاں، ہاتھ میں اک شانہ تھا

عشوۂ صیاد، بازی لے گیا شہباز سے　　　جاگتے آتے تھے فتنے پاؤں کی آواز سے
زلف نے کیا جانے کیا جھک کر کہا دم باز سے　　　خود بخود پہلو میں آبیٹھا کچھ ایسے ناز سے
گویا وہ غارت گرِ دل میرا ہی دیوانہ تھا

لیتے ہی آغوش میں دونا ہوا سودا مرا　　　شوق نے کی گدگدی سی دل نکل آیا مرا
چاکِ غم سے شانہ سمجھا وہ دلِ شیدا مرا　　　اور لگا کہنے کہ گیسو تو ذرا سلجھا مرا
اس طرح سلجھا کہ یہ گویا کہیں الجھا نہ تھا

پھر وہی ہم تھے، وہی غم تھے، وہی رخسارِ فق　　　پھر وہی آنکھیں، وہی گریہ تھا ہمرنگِ شفق
پھر وہی جاں تھی، وہی عالم، وہی سدِ رمق　　　پھر وہی دل تھا، وہی ماتم، وہی درد و قلق
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

(انیس ہند میرٹھ، ۱۰ جنوری ۱۹۰۰ء۔ ص: ۱۰)

﴿۶﴾

تضمین بر مطلع رند لکھنوی

تا کجا وادیِ وحشت میں تگاپو اپنا — تا کجا قصۂ رسوائیِ ہر سو اپنا
تا کجا نیشترِ جاں سرِ ہر مو اپنا — کیوں دل اپنا نہ ہوا گر نہ ہوا تو اپنا

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل ترے پاس نہ جاتا تو بھلا کیا ہوتا — بس میں زلفوں کے نہ آتا تو بھلا کیا ہوتا
جا کے تجھ کو کبھی لاتا تو بھلا کیا ہوتا — فتنے اتنے نہ اٹھاتا تو بھلا کیا ہوتا

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

نہ ہوا مدِ نظر ہم سے مدارا تجھ کو — دوست کیوں پھر دلِ نافہم نے سمجھا تجھ کو
جب مرے جذبۂ پنہاں نے بلایا تجھ کو — تو نہ اٹھا تو یہ کیوں چھوڑ نہ بیٹھا تجھ کو

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل و دلبر کے ستم سے جو میں گھبرانے لگا — کہہ دیا دل کو کہ میں زندہ [illegible] چھوڑنے کا
جھک کے ان کے سرِ گیسو نے یہ کانوں میں کہا — دل مرے پیچ میں ہے تم اسے کھنچنے دو ذرا

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

بیخور و بیخود و بیخواب ہے یعنی کہ یہ دل — بیدل و بیدم و بیتاب ہے یعنی کہ یہ دل
بیکس و بیحس و بے آب ہے یعنی کہ یہ دل — الغرض فتنۂ احباب ہے یعنی کہ یہ دل

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

جب قدم عشق میں بڑھتے ہی چلے جانے لگے　　بڑھ گیا عشق کہ معشوق سے گھبرانے لگے
پھر تو وہ جوش جو ہم کو تھے انھیں آنے لگے　　ہم نہ آئے تو تصور میں وہ فرمانے لگے

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل کے ہاتھوں سے اِدھر ہاتھ ہیں پتھر کے تلے　　اور اُدھر آپ نے مجبور کیا ہم کو وے
تنگدستوں کی طرح کیوں کفِ افسوس ملے　　تم پہ گر زور ہمارا نہیں چلتا نہ چلے

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل جو ہاتھوں سے نہ جاتا تو نہ آتا یہ غضب　　نہ تمہیں سوجھتے ناز اور نہ ہمیں شوقِ طلب
الغرض ہم نے جو کھینچے یہ غم و رنج وتعب　　بخدا دل کے سبب، دل کے سبب، دل کے سبب

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل ہوا جب سے ترا شیفتۂ نازِ صنم　　دکھ پہ دکھ ہم نے سہے روز و شب اور غم پر غم
لیکن اپنا نہ ہوا تو کبھی اے وائے ستم　　یاد رکھنا بتِ طناز ترے سر کی قسم

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

نہ ستم چرخ نے، نے پردۂ حائل نے کیا　　ظلم نے زلف نے، نے چشم، نہ قاتل نے کیا
قتل تو نے نہ ترے غمزۂ قاتل نے کیا　　جو مرے ساتھ کیا، دل نے کیا، دل نے کیا

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

دل کے آجانے سے، تم ناز سدا کرتے تھے　　دلِ خود کام پہ ہم جبر کیا کرتے تھے
لو وہ دل دور کیا جس سے جلا کرتے تھے　　کھو کے کیا ڈھونڈتے ہو ہم نہ کہا کرتے تھے

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

مبتلائے دو بلا ہوں میں گرفتارِ اجل — تو اِدھر یار دغل اور دل اُدھر مارِ بغل
تجھ پہ چلتا ہے نہ جادو، نہ عزیمت، نہ عمل — جھیلتے سیل بلا کو ہیں، سو یہ ہے اہل

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

سن کے یہ قصہ کہا اس نے کہ او خام صفت — ہم پہ قابو نہ سہی، دل پہ ہے تجھ کو قدرت
بے سر و پائے محبت کو کہاں یہ طاقت — بس بیاں بس کہ یہ دعوے ہیں بہر رنگ غلط

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

رباعیات

حمدِ صمدی ہے درۃ التّاجِ قلم
نعتِ نبوی سراجِ وہّاجِ قلم
السجدۃُ معراج ہے فرمانِ رسول
اندازِ فروتنی ہے معراجِ قلم

ساکت ہیں شجر چمن میں گویا تو ہے
سکتہ میں ہیں لب دہن میں گویا تو ہے
کرتے ہیں حجابِ سمع کس کا پردہ
اے پردہ نشیں سخن میں گویا تو ہے

کونین میں ہے وہ کام آنے والا
خود کوئی نہیں ظہور پانے والا
ہے ایک وہی جلوہ دکھانے والا
اٹھارہ ہزار کا بنانے والا

کیا نور ہے کیا نور ہے کیا نور ہے تو
باطن سے عیاں بصر سے دور ہے تو
عرشِ صمدی کجا کجا حبلِ ورید
کتنا نزدیک کس قدر دور ہے تو

اے بادشہِ بارگہہ غیب و شہود
تو ہے سبب غلغلۂ بود و نبود
لولاکَ لما کی شان دونوں میں رہی
سائے سے عدم بنا تو جلوہ سے وجود

سب کچھ ہے اُسی نورِ الٰہی کے لیے
اور وہ دو جہاں کی بادشاہی کے لیے
ٹکڑے دمِ اعجاز کیا ماہِ منیر
یعنی دو چاہئیں گواہی کے لیے

حضرت کو طبیبِ دردِ امت پایا
کیا نسخۂ تدبیر قیامت پایا
رحمت کا زلال اور شفاعت کی شکر
بیمار نے کس مزہ کا شربت پایا

سبحان اللہ محفلِ عالمِ نور
ہنگامہ طرازِ چمن سوز و سرور
ہر طاق میں ہے جلوۂ وحدت کی ضیا
ہر گوشہ میں ہے نورِ نبوت کا ظہور

کچھ آتشِ زرتشت نہ مفقود ہوئی
ہر نار ترے نور سے نابود ہوئی
تھا صلبِ خلیل میں ترا نورِ جلیل
اس واسطے گل آتشِ نمرود ہوئی

جس ہاتھ نے آبر و سوا بخشی ہو
اس ہاتھ سے کیوں کر نہ عطا بخشی ہو
گر ہوں نہ سزاوار عطا بخشی میں
دربارِ الٰہی میں خطا بخشی ہو

دے دام تعلق نہ بہت دم دھاگے
دل توڑ کے دام سوئے کثرت بھاگے
کیا خوب ہے تدبیر چراغِ رہِ شوق
اڑتا ہے رنگِ چہرہ آگے آگے

جاری رہے آبیاریِ فیضِ قبول
پژمردہ نہ ہوں گلکدۂ نظم کے پھول
دزدانِ مضامیں کا ہے اندیشہ بیاں
اللہ کو سونپتا ہوں میں نعتِ رسول

ناانصافوں کا جابجا شور ہے آج
انصاف نقیہ عدل کمزور ہے آج
انصافِ رسول حق نگہبان بیاں
کہتے ہیں جسے شحنہ وہی چور ہے آج

اللہ کا نور چشم بددور یہ ہے
دیکھو اسے ہر نظر کو منظور یہ ہے
رکھا جو علی نے دوشِ احمدؐ پہ قدم
چلائے ملک نور علیؑ نور یہ ہے

جس گل سے حرم ہے باغ باغ آتا ہے
جو بدر ہے بے خسوف و داغ آتا ہے
ظلمت سے بتوں کی تھا اندھیرا ہر سو
اللہ کے گھر میں لو چراغ آتا ہے

سر عین ہے سامانِ عبادت دیکھو
دل لام ہے اسلام کی شوکت دیکھو
یا اسم مبارک علی کا ہے قدم
بت بیت ہوئے قدم کی برکت دیکھو

خورشیدِ افق دینِ مبیں سے نکلا
اسلام غبارِ کفر و کیں سے نکلا
الٹا جو غلافِ کعبہ آئی یہ صدا
اللہ کا ہاتھ آستیں سے نکلا

بازوئے شہنشاہِ ہُدا تھے عباس
دستِ پسرِ دستِ خدا تھے عباس
دریائے فرات سے پھرے تشنہ دہن
اسکندرِ اقلیمِ وفا تھے عباس

یہ اوجِ سعادت نہ ہما نے پایا
کیا دُرِّ نجف بحرِ وفا نے پایا
پیدا ہوئے عباس تو کہتے تھے علی
بازو پسرِ دستِ خدا نے پایا

عباس علی تمام رات بے خواب رہے
پیاسوں کا خیال تھا کہ بے تاب رہے
ایسا کوئی ہے محیطِ عالم میں گہر
اترے پانی میں اور بے آب رہے

عباس علی صفدرِ جرار ہے تو
حیدر ہے خدا کا ہاتھ تلوار ہے تو
اونچا نہ ہو کیوں فوجِ الٰہی کا نشاں
سردار ہیں شبیر علمدار ہے تو

دل بزمِ سخن، نفس ہے بتی میری
چمکاتے ہیں بوتراب رتی میری
بلبل چمنِ مصطفوی کا ہوں بیاں
فردوس کے پھولوں میں ہے پتی میری

منظور ترقی جو ہوئی نوکر کی
کی نوکری مدحِ شاہ کے دفتر کی
پیشی میں گیا حاکمِ بالا کی بیاں
آمد ہوئی باراں سے فزوں اوپر کی

کیا سیف زباں میانِ اعدا ہوں میں
تیغِ دودمِ علی اعلا ہوں میں
مجموعِ فصاحت و بلاغت ہوں بیاں
اوجِ فلکِ نظم پہ جوزا ہوں میں

مشہور ہے اعجاز بیانی میری
مولیٰ کرتے ہیں قدردانی میری
قامت ہے کمانِ فکر، چلّہ ہے نفس
زوروں پہ چڑھی ہے ناتوانی میری

بازار میں کس وقت جگہ پائی ہے
ہونے کو سبک جنسِ گراں آئی ہے
اب کوئی انیس ہے نہ مونس ہے بیاں
یکتا ہوں عجب عالمِ تنہائی ہے

فیضِ سخن آفریں ہے دمساز مرا
کیوں روحِ قدس نہ ہو ہم آواز مرا
بیٹھے رہیں بس چرخِ چہارم پہ مسیح
دکھلا اے سخن زمیں پہ اعجاز مرا

پروردۂ خلاقِ جہاں ہے یہ فقیر
سن اس کی صدا کہ خوش بیاں ہے یہ فقیر
خالق نے بھرا ہے کوٹ کر مغزِ سخن
ہر چند کہ مغزِ استخواں ہے یہ فقیر

گلریز قلم پھولتے ہیں پھلتے ہیں
گل رشک سے دستِ نازنیں ملتے ہیں
یاں چہچہے کرتا ہے بیاں کا طوطی
اس باغ میں بلبلوں کے پر جلتے ہیں

افکار کی معراج دکھاتا ہوں میں
شاہی ہے مری تاج دکھاتا ہوں میں
دو مصرع روشن ہیں بیاں ماہِ دو نیم
اعجازِ بیاں آج دکھاتا ہوں میں

کس ناز سے چلتی ہے نسیمِ گلزار
بلبل نے برنگِ غنچہ کھولی منقار
اللہ رے نیرنگیِ افسونِ حکیم
اک تار سے باندھا ہے طلسمِ گفتار

لو پھول جھڑے زبانِ گفتار کھلی
کیفیتِ رنگِ گل و گلزار کھلی
جب کلکِ فصاحت کو دیا میں نے شگاف
اک بلبلِ فردوس کی منقار کھلی

نقاش نہیں صانعِ قدرت کے سوا
کھنچتا نہیں نقشہ یدِ قدرت کے سوا
فیاضِ ازل سے فیض جاری ہے بیاں
ہوتا نہیں کچھ ختمِ نبوت کے سوا

بیدار نہیں کوئی جہاں خواب میں ہے
کچھ خواب میں کچھ قید میں کچھ صحرا میں

نیرنگ عجب عالمِ اسباب میں ہے
اک عمر سے کیا تفرقہ احباب میں ہے

کب کوئی فضول ہاتھ ملتا ہے بھلا
جب داہنے ہاتھ سے گرہ کھل نہ سکی

مطلب کہیں اس طرح نکلتا ہے بھلا
کب بائیں قدم سے کام چلتا ہے بھلا

جو مکتبِ ایجاد میں داخل ہوگا
دیتا ہے تواضع کا سبق عجزِ ہلال

اوج اس کو فروتنی سے حاصل ہوگا
ناقص اسی مدرسہ میں کامل ہوگا

آوارۂ حرص در بدر پھرتا ہے
کچھ ہاتھ بجز کلوخ آنے کا نہیں

ہمسنگ فلاخن پئے زر پھرتا ہے
کمبخت فضول گردِ سر پھرتا ہے

پیری کی سپیدی ہے کہ مرتا ہوں میں
جنت کی ہوا بھری ہے سینے میں بیاں

جوں شمع دمِ صبح گزرتا ہوں میں
ٹھنڈے ٹھنڈے جو سانس بھرتا ہوں میں

تا چند بیاں شرابِ غفلت کی امنگ
اے خام طمع تلف نہ کر عمرِ عزیز

اس خوابِ گراں سے اٹھ کہ سر ہے تہہ سنگ
پھر دستِ فسوں ہوگا مشتِ پسِ جنگ

ہاں جہل تمہیں سے رنگ لایا پھر کیوں
گر جانتے تھے خانہ خرابی کے سبب

لایا تو گلہ زباں پر آیا پھر کیوں
مہماں کو میزباں بنایا پھر کیوں

سچ ہے کہ جہاں میں سیر کیا کیا دیکھی ۔۔۔ مشرق کی طرف برق تجلا دیکھی
مغرب میں وہ روشنی گئی بن کے ہلال ۔۔۔ دیکھا نہ ادھر کسی کی دیکھا دیکھی

نیچر بابا ہے تری جھولی میں خدا ۔۔۔ لپٹا کہیں تار و پود کولی میں خدا
جھک جاؤ صدا سن کے انا احمد کی ۔۔۔ کیا بول رہا ہے اس رسولی میں خدا

نیچر کا پیالہ پی گئے جان کے پیر ۔۔۔ اب بیٹھے ہوئے کھاتے ہیں خشکی سے پنیر
دولت نہیں ہاتھ میں تو کوشش سے حصول ۔۔۔ کیوں پیٹ رہے ہیں اپنے ہاتھوں کی لکیر

گرمی امسال کس قیامت کی پڑی ۔۔۔ ایک ایک گھڑی ہوئی قیامت کی گھڑی
امنڈا یہ پسینہ، یہ پڑی دھوپ کڑی ۔۔۔ بیساکھ میں لگ رہی ہے ساون کی جھڑی

افلاس میں کیوں ٹیکس لگا رکھا ہے ۔۔۔ اسٹام کے جال میں پھنسا رکھا ہے
قانون نے اک لوٹ مچا رکھی ہے ۔۔۔ اس واسطے اس کا نام لا رکھا ہے

بچے آدم کے ہٹ دھرم ہیں واللہ ۔۔۔ انصاف کی انکھڑیاں پٹم ہیں واللہ
اللہ کے بندے نہ نبی کی امت ۔۔۔ **عبدالدینار والدرہم** ہیں واللہ

اسرار جہاں لطیفۂ غیبی ہیں ۔۔۔ سب عالم تحت و فوق ترکیبی ہیں
واں بارش و امساک یہاں پیداوار ۔۔۔ یہ چرخ و زمیں دونوں میاں بیوی ہیں

حسرت گفت و شنید کی ہے | خواہش آنکھوں کو دید کی ہے
ہے دعوتِ افطار احبا کی خوشی | رمضاں میں ہم نے عید کی ہے

قطعات

یہ پایۂ عروجِ مضامیں کہاں ہے آج | اللہ رے زمینِ سخن آسماں ہے آج
نامی ہے نام اس کا محمد کے نام سے | پیغمبرانِ شعر کا خاتم بیاں ہے آج

یا علی عرش کی چوٹی ہے نشیمن تیرا | سایۂ احمدِ مختار ہے دامن تیرا
جلوہ آرائے حرم زیب دہِ صدرِ رسول | دو گھروں کا ہے اجالا رخِ روشن تیرا

آؤ سن لو پھر یہ گلریزی کہاں اے دوستو | کنجِ تنہائی سے نکلا ہے بیاں اے دوستو
بلبلِ شیراز چہکی بوستاں سے اڑ چلی | بولتا ہے طوطیِ ہندوستاں اے دوستو

ڈنکا جہاں میں آج نہیں ہے کہاں مرا | پہنچا زمیں سے غلغلہ تا آسماں مرا
گر جائیں گے فراعنۂ قوم کے نشاں | اٹھے گا جبکہ خامۂ معجز بیاں مرا

فلک ہے عرصہ مرے کلک کے تگاپو کا | مرا کلام کسی معرکہ میں کب چوکا
من البیان لِسحراً کی دھوم ہے ہر سو | گواہ قولِ نبی ہے بیاں کے جادو کا

قطعات

﴿۱﴾

قاتل سے تنگ آ کے کہا میں نے ایک روز
ہے بیگنہ کشی ترے دیں میں ثواب کیا

مانگیں گے جب جواب ستم ہائے بے سبب
دے گا جواب او بتِ خانہ خراب کیا

تنگ آ گیا جہاں ترے قہر و عتاب سے
ہوگا صفِ جزا میں نہ تجھ پر عذاب کیا

صدہا اسیر عشق کیے قتل بے خطا
کی اختیار یہ رہِ دور از صواب کیا

بیدار ہوگا فتنۂ محشر بھی ایک دن
ہے محو خواب نرگسِ آلودہ خواب کیا

خوں ہائے بے گناہ بڑے رنگ لائیں گے
ملتے ہو کفشِ پا سے لہو کا شہاب کیا

یہ جور دمبدم سرِ پیر و صغیر کیوں
یہ ظلم پے بہ پے بہ سرِ شیخ و شاب کیا

مشتاق نیم کشتِ ادا ہائے ناز کیوں
عشاق نیم بسملِ طرز حجاب کیا

کھولیں گے حشر میں جو ترا دفترِ ستم
اس جورِ بے حساب کا ہوگا حساب کیا

وعدوں میں یہ دروغ اور اس درجہ بیدریغ
بھولے وعید و وعدے ثواب و عذاب کیا

جب دادگاہِ حشر میں لائیں گے آپ کو
واں بھی یہ جلوہ ہوگا رہینِ نقاب کیا

چلائیں گے جب آ کے تہہِ عرش بے گناہ
آئے گا تو نہ زیرِ عتاب و خطاب کیا

فریاد اے خدائے قیامت یہی ہے وہ
جس نے ملائے خاک میں لاکھوں شباب کیا

دامن ترا پکڑ کے نہ چھوڑیں گے دیکھنا
کرتا ہے پھر خدائے شدید العتاب کیا

سن سن کے یہ تمام تظلم کی گفتگو پردہ الٹ کے کہتے ہیں "اس کا جواب کیا"

پایا بیاں عروجِ فلک آفتاب نے
تھا یہ بھی ذرۂ گزرِ بوتراب کیا

﴿۲﴾

مجھے جب کاٹ کر گردن وہ قاتل ریگ پر ڈالے
تو جوشِ خونِ ناحق سے دگرگوں رنگِ دنیا ہو

اداسی بن کے آندھی عرصۂ امکاں پہ چھا جائے
سیاہی ابر کے پردہ میں کہساروں سے پیدا ہو

زمیں غش میں پڑی ہو بیم آشوبِ قیامت سے
فلک اندیشۂ تہمت سے سردر جیب پھرتا ہو

اداسی خشک وتر سے عالمِ ایجاد کے برسے
رہیں چپ چاپ دریا جسطرح سنسان صحرا ہو

زمیں کے سونے والے چونک اٹھیں مزاروں میں
فلک کے جاگنے والوں کی آنکھوں میں اندھیرا ہو

دروں کی یک بیک آنکھیں کھلی رہ جائیں حیرت سے
برنگِ صورتِ دیوار دیواروں کو سکتا ہو

مرقع پر جہاں کے ہو سماں تصویر خانے کا
کہ تکتا ایک کو ہو ایک اور کچھ کہہ نہ سکتا ہو

جہاں سر پر اٹھالے صرصرِ فریاد کی آندھی
سپہرِ پیر صحرائے قیامت کا بگولا ہو

زمیں پر تیزیِ رفتار سے تلوار چلتی ہو
کہ حلقِ سر بریدہ ہو جہاں نقشِ کفِ پا ہو

گزرتی ہو قیامت جادہ ہائے شہرِ ہستی پر
کہ شور انگیز ہر کوچہ سے رستا خیز کبریٰ ہو

چڑھے ہوں فتنے دیواروں پہ اٹھ کر صحنِ محشر سے
کہ ہر اک ذرہ رقصِ مرغِ بسمل کا تماشا ہو

فرازِ پشتِ ماہی ٹیک دے گاؤ زمیں زانو
کہ یہ بارِ مصیبت ہے نہ اٹھے گا نہ اٹھا ہو

گریزاں یکدگر سے ہوں عناصر خوف کے مارے
مفارق عکس سے صورت تو صورت سے ہیولیٰ ہو

ہلائے واقعہ شانہ کو اے انصاف کھول آنکھیں
لگائے حادثہ ٹھوکر کہ اے حشر اٹھ کے بیٹھا ہو

برستی ہو خرابی چار دیوارِ عناصر سے
موالید ثلاثہ کو مفاجاتوں کا کھٹکا ہو

اٹھائے گریہ کا طوفاں ترائے قدس کے سکاں
سفینہ کی طرح عرشِ الٰہی زیر و بالا ہو

بھرا ہو بسکہ خونِ دل سے جوفِ عالمِ امکاں
کہ ہر نالہ گرہ بندِ گلوئے چرخِ مینا ہو

تماثیلِ فلک مٹ جائیں نقشِ آب کی صورت
تلاطم میں محیطِ آسماں تمثالِ دریا ہو

ترازو ناوکِ فریاد ہو زہرہ کے پہلو میں
شگافِ کلک کی مانند تیرِ چرخ جوزا ہو

زحل ہو تیرہ و تاریک شکلِ روزنِ گلخن
کہ دودِ خلق سے ایوانِ کیواں میں اندھیرا ہو

برنگِ جیبِ عاشق ہو ردائے مشتری پارہ
قمر کے دل میں داغ اور حلق میں ہالہ کا پھندا ہو

ستارے ٹوٹتے محسوس ہوں تارے نہ ہوں لیکن
خجالت کا عرق ہاتھی سے گردوں کے ٹپکتا ہو

سکندر کی طرح ظلمات کے پردے میں جا نکلے
نہ سوجھے آسماں خورشید شپّر وار اندھا ہو

سمن ہو سنگ، خوں ہو رنگ، غنچہ تنگ، گلشن گل
صبائیں لنگ، حوضیں دنگ، کیسا ڈھنگ بگڑا ہو

گلِ رخسار کے اوراق تر ہوں اشکِ گلگوں میں
شہادت نامۂ بسمل بیاضِ روئے زیبا ہو

صراحی میکدے میں ہچکیاں لے لے کے روتی ہو
لہو ہو ہو کے شیشہ کا کلیجہ منھ کو آتا ہو

صراحی ہائے گردن سے ہو قلقل کی صدا پیدا
سناتی سرگزشتِ تیغ خوں نخچیر گویا ہو

سحاب آسا ہو گریاں کعبہ اس نخچیر کی صورت
تنور شعلہ زن سوراخ دیوارِ حرم کا ہو

خیالِ سختیِ جورِ بتاں ہو نیشتر فرسا
رگِ سنگِ سیہ رنگِ حرم کا خوں نہ تھمتا ہو

لہو رنگِ شفق میں ہو گریباں گیرِ گردوں کا
سرِ دستِ فغاں میں دامنِ عرشِ معلّٰی ہو

عیاں جوہر نہ ہوں چیں بر جبیں ہو تیغ قاتل سے
کفِ جلاد میں خنجر کفِ افسوس ملتا ہو

حسینوں کو یہ حیرت ہو کہ کتنا ہی کوئی دیکھے
جبیں سے چیں نہ اصلاً صورتِ آئینہ پیدا ہو

نگہ تھرا کے دشنہ پھینک دے چاہِ زنخداں میں
کہ تا خونِ شہیدِ ناز کا شاہد نہ پیدا ہو

تغافل سو رہے کھا کر کہیں زہرِ عتاب اس کا
ستم سے نرگسِ بیمار کو پرہیز کیا کیا ہو

کھلانے سرمہ حیرانی لگے چشمِ سخن گو کو
ولے وہ فتنہ جو آنکھوں سے اٹھا ہو نہ چپکا ہو

طریقہ سیکھ جائے بے نیازی دلنوازی کا
ولے کس کام کا وہ کام جس کا وقت گزرا ہو

کمر سے کھول کر شمشیر ابرو طاق پر رکھ دے
لگا کر نیزہ، دیوارِ مژہ سے ناز چلتا ہو

فنا شوقِ شہادت ہو ہوا ذوقِ سیاست ہو
نہ خنجر کو تمنا ہو نہ گردن کو تقاضا ہو

رقیب روسیہ کرتا جو ہو دعویٰ خدائی کا
وفورِ شرم سے مانندِ فرعوں غرقِ دریا ہو

لہو روتے ہوں ہندو اور مسلماں جس طرف دیکھو گواہِ عشق طرف آستیں سے آشکارا ہو
حیا کو چشم کے دروازۂ خونیں پہ لیجائیں کہ بتلا گر کہیں قاتل کو پردہ میں بٹھایا ہو
ستم کو جنبشِ مژگاں سزا دے تازیانہ کی
ستمگر سے جوابِ خون ناحق کا تقاضا ہو

﴿۳﴾

گر ادھر کو ہووے گزر ترا تو یہ عرض کیجیو قاصدا
کوئی ہے کہیں ترا مبتلا اُسی خستہ کا یہ پیام ہے
میں دو چشم محو کو کیا کروں کہ رہین ہر سر راہ ہیں
میں نگاہِ شوق کو کیا کہوں کہ فدائے ہر لبِ بام ہے
کوئی کہتا ہے کہ اٹھاؤ بھی تہہ خاک اسکو دباؤ بھی
لو میں مر چکا ہوں تم آؤ بھی کہ یہ کام باعثِ نام ہے
ترے دل میں ہائے اثر نہیں تجھے کچھ بھی میری خبر نہیں
تو ہے تیر آہن اگر نہیں یہ اگر نہیں تو رخام ہے
تری جھوٹی ہیں یہ حکایتیں تری فرضی ہیں یہ شکایتیں
جو اسی کی ہیں یہ شکایتیں تو اسے بھی میرا سلام ہے
ترے جوشِ غم میں یہ حال ہے خور و نوش تک بھی وبال ہے
کوئی غم ملا تو حلال ہے جو غذا ملی تو حرام ہے
جو کہوں کہ خون نہ پی مرا تو کہے کہ خون حلال ہے
جو کہوں کہ مئے مرے ساتھ پی تو کہے کہ بادہ حرام ہے
کوئی ہمصفیر بیاں نہیں یہ دیارِ عشق نہ ہو کہیں
نہ وہ آسماں ہے نہ وہ زمیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

روبرو داورِ محشر کے ہم آتے جاتے
اس طرح قتل کا افسانہ سناتے جاتے

تجھ سے فریاد ہے اے حاکمِ دیوانِ جزا
کہ یہ کافر ہیں غریبوں کو مٹاتے جاتے

اک ستمگر سے کہا میں نے کہ غمزے تیرے
خاک ہیں عالمِ امکاں میں اڑاتے جاتے

ناز و انداز میں ہیں تیرے جفا کے نشتر
خونِ عشاق ہیں بے جرم بہاتے جاتے

چشم کافر نے تری لوٹ مچا رکھی ہے
قافلے اہلِ حرم کے نہیں آتے جاتے

خلل اندازِ جہاں ہے تری چشمِ رہزن
لوگ اقلیمِ عدم سے نہیں آتے جاتے

پھر کلوخ تنِ خاکی کو نہ گردش رہتی
آسماں گر یہ فلاخن نہ پھراتے جاتے

حسن والوں کے لیے عیب برا ہوتا ہے
دل نہ لیتے تو بھلا آنکھ چراتے جاتے

نہ ملا تو نہ ملا تو نہ ملا مثلِ نفس
عمر گزری ہے تری راہ میں آتے جاتے

آتے ہیں اشک میں ٹکڑے دلِ پُرحسرت کے
کچھ پتا اس نئی دنیا کا لگاتے جاتے

مانگتا کوئی تو دیتے اسے حسرت کا صلا
چاہتا کوئی تو دیدار دکھاتے جاتے

شوق سے بر میں تڑپتا دلِ شیدا کوئی
تو کبھی حلقۂ آغوش میں آتے جاتے

انکھڑیاں سرخ ہوئیں قہر سے اتنا سن کر
ہاتھ بھی قبضۂ شمشیر پہ لاتے جاتے

یوں کہا قہر میں پھر تول کے شمشیرِ ستم
لے ابھی سر ہیں ترا ہم تو اڑاتے جاتے

دیکھ کر شکلِ غضب کچھ نہ رہی تابِ بیاں
کچھ نہ بن آئی بجز سر کو جھکاتے جاتے

﴿۵﴾

قطعہ در تشابیہ کوزۂ قند کالپی

بجواب قطعہ ڈلی غالب دہلوی

میرے محسن نے جو بھیجا ہے مجھے کوزۂ قند
بستہ اس کوزے میں احسان کا دریا کہیے

سر فروبردہ تفکر کہ اسے کیا لکھیے / لب فروبستہ تکلم کہ اسے اسے کیا کہیے

"سیرِ خمیازۂ صدگونہ تمنا" کیجے / کسی محبوب کا، "شیریں دہنِ وا" کہیے

"معنیِ جوہر شفاف تماشا" کیجے / "صورتِ یوسفِ مصری" کا ہیولا کہیے

بصفا "آئینۂ دستِ سکندر" لکھیے / بضیا "آئینہ دارِ کفِ موسیٰ" کہیے

"قالبِ صنعتِ رخسارۂ سلما" لکھیے / "نار بیدانۂ پستانِ زلیخا" کہیے

"نوگل گوزۂ گلزارِ ارم" کیجے رقم / "ساغرِ فضۂ فردوس مطرا" کہیے

"خیمۂ گوہرِ حورانِ بہشتی" لکھیے / "کنگرِ بارگہِ قیصر و کسرا" کہیے

"سینہ بندِ صنمِ پردہ نشیں" کیجیے فرض / "کلہِ تازہ" جوانانِ خود آرا کہیے

"گوئے دستنبوئِ اصحابِ طرب" کیجیے یقیں / "جامِ سیماب" اسے اربابِ عمل کا کہیے

"سیمگوں پلۂ میزان طبرزد" لکھیے / نقرئی حقۂ پر لولوئے لالا کہیے

"سپرِ تلخیِ ایامِ مصیبت" لکھیے / خُودِ شمشیر سم آلودۂ ایذا کہیے

ہمسرِ بیضۂ طاؤسِ نگاریں لکھیے / حوض آذوقۂ مرغانِ شکرخا کہیے

منجلی پیکرِ ماہِ شبِ ہفتم لکھیے / طرفہ قندیلِ در کعبۂ والا کہیے

سُم سیمیں فرس چابک شیریں لکھیے / سرِ پرویز خیالِ شکر آما کہیے

سنگِ قالینِ سلاطینِ مظفر لکھیے / سانگینِ طربِ سنجر و دارا کہیے

کیوں اسے کیسۂ دلاّک سے دیجے تشبیہ / کیوں اسے بوتۂ سبّاک سے مانا کہیے

کیوں اسے ساغرِ بلّور سے بہتر لکھیے / کیوں اسے کاسۂ فغفور سے بالا کہیے

کیوں اسے تازہ حبابِ لبِ کوثر لکھیے / کیوں اسے آمۂ شیرینیِ معنی کہیے

طبقِ سیم کو عرشِ صمدی کیجیے فرض
اور اسے قمقمۂ عرشِ معلّٰی کہیے

(جلوۂ یار، میرٹھ: اپریل ۱۹۲۱ء ص:۷)

﴿۶﴾

قطعہ نانِ جویں

درخدمتِ حاجی محمد علی خان صاحب حاکم اپیل ریاست جیپور

خداوند بیچوں کے احساں سے اُتری — مسیحا پہ انجیل احمدؐ پہ قرآں
عدن میں جواہر یمن میں ستارے — چمن میں بہاراں زراعت میں باراں
کلیمِ الٰہی سرِ طورِ سینا — وہ خضرِ خجستہ لبِ آبِ حیواں
دماغِ خرد مند میں عقلِ روشن — دلِ اہلِ اخلاص میں نورِ عرفاں
ضیا خانۂ حسیہ میں تماشا — نہاں خانۂ گنجِ باطن میں ایقاں
طریقانِ نورِ خدائی کو وصلت — غریقانِ بحرِ معاصی کو غفراں
اندھیرے میں خورشید ظلمت میں انجم — خرابہ میں مہتاب صحرا میں سلطاں
محبت میں شاعر کے مضمونِ رنگیں — مرقع میں عاشق کے تصویرِ جاناں
جو کاخِ مصور کی خلوت میں یوسف — تو صرحِ ممرّد کے اندر سلیماں
فقیروں کو نعمت غریبوں کو دولت — حقیروں کو عزت مریضوں کو درماں
نگیں سے ہے توقیر کون و مکاں کی — نگیں نام روشن سے ہوتا ہے ذیشاں
ہوا کعبہ یہ خانۂ بے تکلف — کہ اُترے ہے حاجی محمد علی خاں

مرا ماحضر ہو قبول اے بیاں اب
کہ لختِ جگر سے ہے دعوت کا ساماں

﴿۷﴾

قطعہ برافسوسِ تبادلہ جناب بالسروپ شکن

ہاں تیرے جوشِ خاطرِ رنگیں سے اے شکن — تر ہے زبانِ کلکِ سخن کامیاب ہے
دریا اگر ہنر ہے تو تو اس کا جوش ہے — معنی اگر گہر ہے تو تو اس کی آب ہے

الفت ہے انجمن شکن اس کا چراغ ہے
ہے دوستی چمن شکن اس کا گلاب ہے

گلزار ہے بیاں شکن اس کی بہار ہے
معشوق ہے سخن شکن اس کا شباب ہے

رنگِ سرور دردِ جدائی سے اڑ گیا
مینائے دل میں خون بجائے شراب ہے

داغِ مفارقت سے ہوا دودِ دل بلند
دن کر دیے سیاہ یہ خوب آفتاب ہے

سبزہ کی طرح غنچۂ احباب باصفا
پامال صدمۂ ستم اضطراب ہے

جاتے ہی تیرے اے شکنِ گیسوئے وفا
مانندِ زلف دل کو غضب پیچ و تاب ہے

رنگیں جمالِ دوست ہے کہ نسخۂ حیات
آباد دوستی سے جہانِ خراب ہے

جم کر رہا نہ صورتِ نقشِ قدم کوئی
اے آسمان زمیں پہ عجب انقلاب ہے

بدلا ہے رنگ تیرے تبدل نے اے شکن
اس فصل ناگہاں سے جگر خوں کا باب ہے

شیرازہ ٹوٹ جائے نہ دل کی کتاب کا
چودہ رتن میں تو شکن انتخاب ہے

کیا اہلمد دفتر الفت جدا ہوا
دل پر بیاں کے آج غمِ بے حساب ہے

قطعاتِ تاریخ

﴿۱﴾

قطعۂ تاریخ وفات جناب مولوی یٰسین صاحب

مر گئے آہ مولوی یٰسین — تھا وہ ابجد شناس آئیں کا
لوح پر دیکھ کر حروفِ جُمّل — لکھ بیاں ''غین و میم یٰسیں کا''

۱۳۰۸ ہجری

﴿۲﴾

تاریخ وفات حضرت واجد علی شاہ فردوس آرامگاہ

جمالِ حضرتِ واجد علی شاہ — زمیں پر اے فلک تھا دوسرا چاند
جہاں ہے دیدۂ مردم میں تاریک — اندھیرا چھا گیا کیوں جب اٹھا چاند
رکھا جب گور میں اس نورِ حق کو — پکارے سب گہن میں آگیا چاند
ریاضِ جاہ کا رنگیں قبا پھول — سپہرِ جود کا روشن لقا چاند
ملائک پاسباں انجم جواہر — فلک تختِ مرصّع پادشا چاند
ہوا کلکتہ واقع سوئے مشرق — تعجب ہے کہ مشرق میں چھپا چاند
ہوئے اس غم میں غرقِ نیل ماتم — عطارد مشتری، زہرہ، سہا چاند
بیاں نے جب اٹھایا کلکِ تاریخ — ورق تحریرِ غم کا بن گیا چاند

زروئے طیش کی ہاتف نے فریاد
چھپا مٹی میں مٹیا برج کا چاند

۱۲۹۶ + ۹ = ۱۳۰۵ ہجری

﴿۳﴾

قطعہ تاریخِ وفات عزیزی محمد سلطان

میرے قبلہ حکیم دین احمد صدر دیوانِ کشورِ خوبی
ان کے بیٹے نے زندگی میں کیا سر و سامانِ کشورِ خوبی
اس کے جلوہ نے کردئے پر گل جیب و دامانِ کشورِ خوبی
اس کے بارِ الم سے پیر ہوئے نوجوانانِ کشورِ خوبی
اس کی جنبش سے بے ثبات وسکوں ہوئے سکّانِ کشورِ خوبی
مٹ گیا ہائے مل کے مٹی میں گہرِ کانِ کشورِ خوبی
اس کے ماتم میں خاک اڑاتا ہے ملکِ ویرانِ کشورِ خوبی
بن کے دولہا گیا وہ حوروں میں شہِ خوبانِ کشورِ خوبی
گم عزیزوں کے قافلے سے ہوا مہِ کنعانِ کشورِ خوبی
پھول ٹوٹا کہ ہو گیا برباد چمنستانِ کشورِ خوبی
بڑھ گیا وہ چراغ علم و ہنر گھٹ گئی شانِ کشورِ خوبی
اس کو چھٹی ملی تو بند ہوا ہر دبستانِ کشورِ خوبی
اس کی رحلت سے بے چراغ ہوئے طاق و ایوانِ کشورِ خوبی
بہرِ تاریخ کہہ رہے ہیں بیاں سو گوارانِ کشورِ خوبی

روتے والوں کا ساتھ دے کے لکھو
"ہائے سلطان کشورِ خوبی"

۱۳۱۷ ہجری

(لسان الملک، میرٹھ: مئی ۱۸۹۹ء، ص:۸)

﴿۴﴾

قطعۂ تاریخ وفات بابو محمد علی صاحب تحصیلدار علی گڑھ

غمِ ہجر بابو محمد علی کا
کہ تھا ہند کے پیش کاروں میں نامی

رلائے نہ کیوں چشم کو خوں کے آنسو
کہ دل پر چلی تیغِ ناشادکامی

جمال اس کا تھا غیرتِ ماہِ کنعاں
دُرِ تاجِ عزت ہو اس کی غلامی

حسد کیوں نہ ہو چرخِ گرداں کو اس سے
کہ سیارے تھے اس کے در کے سلامی

زباں تھی گل افشانِ رنگیں بیانی
دہن تھا شکر ریزِ شیریں کلامی

سخن فہم، خوش خلق، ذی عقل، صالح
شریعت کا پابند، ملت کا حامی

ملا اس کو تحصیلداری کا مژدہ
یہ پیغام نکلا اجل کا پیامی

مقرر ہوا قحط کا منتظم وہ
کہ بازو میں تھی قوتِ انتظامی

یہ آخر سفر آخرت کا سفر تھا
ہوئی قطع منزل بصد تیز گامی

گرا دشت میں رَخشِ عمرِ رواں سے
رکاب اس کی اے چرخ جھک کر نہ تھامی

غضب تند و سرکش ہے ابلق جہاں کا
سواروں سے کرتا ہے یہ بد کلامی

کدھر ہے کوئی بادِ صحرا سے پوچھے
وہ شمعِ سرِ محفلِ نیک نامی

کہاں ہے وہ بچھڑا ہوا کارواں سے
مٹے گا نہ داغِ فراقِ دوامی

بیاں کو نہ کیوں فکرِ تاریخ ہوتی
سمجھتا تھا وہ رشکِ عرفی و جامی

بس اقبال سر پیٹ کر یوں پکارا
ہوا دشت میں گم وہ یوسف گرامی

۱۳۱۴ - ۱ = ۱۳۱۳ ہجری

(لسان الملک، میرٹھ: اگست:۱۸۹۶ء)

﴿۵﴾

قطعۂ تاریخ وفات میر اولاد علی صاحب میرٹھ

ہائے لختِ دلِ بنیاد علی — سن سکے کون سنانی تیری
تھا خود اولاد علی نام ترا — حُبِّ حیدر تھی نشانی تیری
بیس اور سات برس دنیا میں — رہی کیا نور فشانی تیری
صفحۂ دہر سے آخر وہ شکل — مٹ گئی یوسفِ ثانی تیری
اے جواں رحم نہ کھایا تجھ پر — موت تھی دشمنِ جانی تیری
پھرتی ہے آنکھ میں تصویر تری — رہے ہونٹوں پہ کہانی تیری
حسرتیں، آرزوئیں، امیدیں — سب میں ہے مرثیہ خوانی تیری
سالِ تاریخ سناتا ہے بیاں — یہی ہے کچھ تو نشانی تیری

کھینچ کر آہ کہا ہاتف نے
آہ تو اور جوانی تیری

۱۳۰۵ ہجری

﴿٦﴾

قطعہ تاریخ تولد فرزند ڈاکٹر سید حسین صاحب لال کرتی میرٹھ

ڈاکٹر والا گہر سید حسین — آپ کے گھر چاند سا بیٹا ہوا
فیض حق کا ہے ترشح رات دن — گھر پہ ہے ابرِ کرم چھایا ہوا
کھل رہے ہیں غنچہ ہائے آرزو — گلشنِ امید ہے پھولا ہوا
کیوں نہ ہو پُر نور چشمِ والدین — گھر میں نازل عرش کا تارا ہوا
آئی جنت سے نسیمِ احمدی — خانہ رشکِ جنت الماویٰ ہوا
پھیلی ہے ہر سو شمیمِ حیدری — جانفزا الطاف کا جھونکا ہوا
مچ گئی اک دھوم شہر و صدر میں — شورِ عشرت جابجا برپا ہوا

نیک بختی آپ کی لائی ثمر نونہالِ عزوشاں پیدا ہوا
یادگار سال کی خاطر بیاں فکر تاریخِ ولادت کا ہوا
مشورہ ہاتف سے میں کرنے لگا اس خوشی کا چرخ تک چرچا ہوا

روشنی دیکھی تو بولا "واہ واہ"
لکھیے۔"نازل عرش کا تارا ہوا"

۱۲۹۳ + ۲۴ = ۱۳۱۷ ہجری

﴿۷﴾

قطعہ تاریخ تولد فرزند ڈاکٹر خواب داد خاں صاحب

ڈاکٹر خواب داد خاں کو بیاں گلِ دستار عزوشاں کہیے
عندلیب ریاضِ فضل و کمال سرو گلزار امتناں کہیے
ابرِ تر ہے نفس کہ بادِ بہار گل فروش و گہر فشاں کہیے
کلکِ مضموں نگار و معنی بند فوج میں فتح کا نشاں کہیے
دھودے داغ لوحِ معنی سے نظم کا بحرِ بیکراں کہیے
کلکِ چالاک طبعِ صافیِ نور مثلِ دریا رواں دواں کہیے
رزم میں اس کو پیلسم لکھیے بزم میں اس کو جم نشاں کہیے
جود میں اس کو ابر تر لکھیے خلق میں اس کو بوستاں کہیے
حق نے بخشا ہے چاند سا بیٹا عالم افروز دودماں کہیے
کیا اخلاصِ خاص نے ایما سالِ تاریخ اے بیاں کہیے
مہِ اوجِ شرف ہے جلوہ کناں رحمتِ حق کو مہرباں کہیے

یوں دلِ شاد اچھل کے کہنے لگا
کہ "مہِ خواب داد خاں" کہیے

۱۳۱۲ ہجری

﴿۸﴾

قطعہ تاریخ تولد فرزند منشی احسان عظیم صاحب

ہوا احسانِ عظیمِ احدی سے لڑکا — گلِ رخ دیکھ کے جس کا دلِ بلبل پھڑکا

رخِ فرزند سے ہے حق کی تجلی پیدا — طور کا شعلۂ خاموش دوبارہ بھڑکا

جوش عشرت کا ہوا نوبتِ اقبال بجی — چرخ بر سے خوشیِ عیش کا بادل کڑکا

غنچۂ خاطرِ احباب کھلا صورتِ گل — دلِ حاسد میں ہوا خارِ حسد سے دھڑکا

دیکھ کر روئے فلک ہاتفِ غیبی نے کہا

زیب کیا دیتا ہے ماں باپ کو موتی لڑکا

۱۳۱۵ ہجری

دیا حق نے فرزندِ رشکِ چراغ — منور ہوئی بزمِ ناز و نعیم

گہر بار دامانِ احساں ہوا — سحابِ عنایات ربِ کریم

دمِ فکر تاریخ آئی صدا

ہے تاریخ نامی سراج العظیم

۱۳۱۵ ہجری

﴿۹﴾

قطعہ تاریخ مبارک باد بر صحت وشفا

جنرل اعظم الدین خاں بہادر مدار المہام ریاست رام پور

اعظم الدیں خاں بہادر فخر ہند — زیب دیتی ہے حکومت آپ کو

حُسن صورت، حسنِ سیرت، حسنِ فہم — کیوں نہ چاہے پھر ریاست آپ کو

وہ ادائے جامہ زیبی، دیکھ کر — پیار کرتی ہے وجاہت آپ کو

صدرِ زینِ توسنِ اقبال پر — جب چڑھا دیتی ہے ہمت آپ کو

سرو قد پر دیکھ کر زیبِ سلاح — داد دیتی ہے شجاعت آپ کو

تیغ نصرت ہاتھ سے چھٹتی نہیں ۔۔۔ دی ہے قدرت نے وہ قدرت آپ کو
مالک سیف و قلم ہیں آج آپ ۔۔۔ پھبتی ہے حکمت حکومت آپ کو
کی عنایت حق نے افلاطوں کی رائے ۔۔۔ اور ارسطو کی فطانت آپ کو
گوشۂ خاطر میں کس تکریم سے ۔۔۔ دی جگہ والی نے حضرت آپ کو
اس مکاں سے خوب تر کیا چاہیے ۔۔۔ تکیہ گاہ ناز و نعمت آپ کو
اس سے بہتر چاہیے کیا سائباں ۔۔۔ رکھتی ہے سایہ میں رحمت آپ کو
جان سے دل سے دعائیں رات دن ۔۔۔ دیتی ہے صحت سلامت آپ کو
آپ گل ہیں گلشنِ اقبال کے ۔۔۔ کیوں نہ رکھے سر پہ رفعت آپ کو
دیکھیے اس کو بھی حق نے کھو دیا ۔۔۔ گر مرض نے دی اذیت آپ کو
شکل موسیٰ کوہ نینی تال سے ۔۔۔ لے کے اترا فیض رحمت آپ کو
جلد تر طے ہوگئے ایام ہجر ۔۔۔ یاد کرتی تھی رعیّت آپ کو
کوہ سے آفاقِ دولت میں ہوئی ۔۔۔ صورتِ خورشید رجعت آپ کو
آپ سے اقبال ہے بالا بلند ۔۔۔ سرو بالا دے ہے قامت آپ کو
شافیِ مطلق نے بخشی ہے شفا ۔۔۔ تندرستی کی عنایت آپ کو
ہو چراغاں کیوں نہ شہر رامپور ۔۔۔ شمع روشن دی ہے طلعت آپ کو
مچ گیا ہنگامۂ عیش و طرب ۔۔۔ ڈھونڈتی تھی بزم عشرت آپ کو
خلق پر وا ہو گیا بابِ کرم ۔۔۔ مانگتے تھے اہلِ حاجت آپ کو
آسماں پر سعدِ اکبر کہہ چکا ۔۔۔ نیّرِ برجِ سعادت آپ کو
رقص عشرت سے رجھاتی ہے سدا ۔۔۔ زہرہ وقت جشن و جلوت آپ کو
دولت و اقبال لائے شکر ہے ۔۔۔ پوچھتے تھے خود بدولت آپ کو
سایہ مشتاق علی خاں کا رہے ۔۔۔ جس نے دی کرسی عزّت آپ کو
آپ کا داعی بیاں دیتا ہے نذر ۔۔۔ گوہرِ کانِ طبیعت آپ کو

دیکھنے آیا ہے سلکِ دُر لیے　　جلوۂ حسنِ فصاحت آپ کو
دیکھیے روشن سوادِ چشم ہے　　سُرمۂ چشمِ بصیرت آپ کو
ہاتف اور ہم قطعۂ تاریخ سال　　پیشکش دیتے بمنت آپ کو

آپ جاکر دی یہ دولت نے نوید
ہو مبارک غسلِ صحت آپ کو

۱۸۸۸عیسوی

(لسان الملک، میرٹھ: جولائی ۱۸۸۸ء)

﴿۱۰﴾

قطعۂ تاریخ بر عطائے خطاب

جناب احفاظ الرحیم خان صاحب، تحصیلدار جبل پور

میرے تحصیلدار والا پر　　عز و مکنت کا فتح باب ہوا
کار سرکار قیصری کا عروج　　کامگاری میں کامیاب ہوا
گردن عز و شاں بلند ہوئی　　مہرباں مالک الرقاب ہوا
طالع نوجوان مبارکباد　　حسنِ اقبال کا شباب ہوا
اختر آسمانِ اوج شرف　　جلوہ گر باصد آب و تاب ہوا
معدنِ لعل ہے جبل یعنی　　تو جبل پُر سے انتخاب ہوا
شوق نے کی بیاں سے فرمائش　　کہ فصاحت میں لاجواب ہوا

پڑھ دیا صاف مصرع تاریخ
واہ وا خان کا خطاب ہوا

۱۳۱۵ ہجری

مبارک باد

﴿۱﴾

بر تولید فرزند ارجمند منشی سید محمد صاحب

الٰہی یہ فرزند جیتا رہے　　محمد کا دلبند جیتا رہے

یہ ہو باپ کی طرح صاحب خرد　　لے آغوش میں اس کو تیری مدد

بہار اس کے رخ کی دو چنداں رہے　　گلِ غنچہ لب ہے یہ خنداں رہے

رہے گلشنِ دہر جب تک ہرا　　رہے بس یہ پودا ہرا اور بھرا

یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور دل کا چین

رہے زندہ یارب معِ والدین

﴿۲﴾

بر عطائے خطاب نواب اسد اللہ خان

آپ کو افتخار نوابی　　اسد اللہ خاں مبارک ہو

بدر کامل ہوئے ہلال سے تم　　پرتو امتناں مبارک ہو

وہ قدم چومنے زمین آئی　　وہ جھکا آسماں مبارک ہو

ظلِ سبحاں ہے سایۂ سلطاں　　مہر کا سائباں مبارک ہو

جلوہ گر منزلِ اسد میں ہوا　　نیر عزوشاں مبارک ہو

مثل خورشید سر بلند ہوا　　فرق تا فرقداں مبارک ہو

قیصر ہند نے دیا اعزاز　　اوج نام و نشاں مبارک ہو

شکل مہہ اکتساب نور کیا　　مہر یوں مہرباں مبارک ہو

آئی بادِ نسیمِ نوروزی　　خندۂ گلستاں مبارک ہو

تاجِ سر شہر کے ہو تم سرتاج　　طرۂ عزوشاں مبارک ہو

آپ سے سرزمینِ میرٹھ کو　　رفعتِ آسماں مبارک ہو

وہ ہے زہرہ تو آپ ہیں برجیس　　ہے اسد میں قراں مبارک ہو

جلوۂ مظہرِ شیونِ کریم　　خانِ احسانِ خاں مبارک ہو

آپ کے سر پہ عدل نے رکھا　　چترِ نوشیرواں مبارک ہو

آپ کے کوہِ حلم کا پلہ　　ہے زمیں سے گراں مبارک ہو

کاخِ گردوں سے آپ کی کرسی　　ہے رفیع المکاں مبارک ہو

دے رہا ہے سپہر پر آواز　　اوجِ بختِ جواں مبارک ہو

چاند سا رخ ہزار چند ہوا　　چاندنی کا سماں مبارک ہو

مجلسِ نو میں آپ کا اجلاس　　ہاں مبارک ہو ہاں مبارک ہو

ہاتھ نکلا حجابِ معنی سے　　نذرِ کلکِ بیاں مبارک ہو

قدرداں قدرِ علم کرتے ہیں　　علم کو قدرداں مبارک ہو

تم سنو اور کہیں قیامت تک　　اہلِ ہندوستاں مبارک ہو

ہو مبارک نہ کس طرح جس کا　　جدِّ والا نشاں مبارک ہو

وہ بیاں عندلیبِ ہندوستاں　　آج ہے گل فشاں مبارک ہو

چمن و باغ و بلبل و گل کو　　آپ سا باغباں مبارک ہو

سایۂ رحمتِ الٰہی ہو　　ظلِ حق جاوداں مبارک ہو

اسداللّٰہیوں کے حلقہ میں
تو بھی ہے اے بیاں مبارک ہو

(لسان الملک، میرٹھ: اگست ۱۸۹۵ء)

نوحہ

بروفاتِ برادرِ عزیز مولوی سید محمد

ٹوٹا جگر پہ کوہِ محن وامصیبتا — اے اوفتادِ چرخِ کہن وامصیبتا

ہو سرمہ کور دیدۂ کنجِ لحد کا وہ — اے آسیائے دورِ زمن وامصیبتا

گھر سے بعید منزلِ خاکی میں ہو غروب — وہ آفتابِ صبحِ وطن وامصیبتا

سید محمد ابن علی راستی خرام — وہ متقی، وہ نیک چلن وامصیبتا

وہ زہد و حلم اس کا طریق آہ آہ آہ — وہ پند و وعظ اس کا سخن وامصیبتا

وہ افتخارِ تازہ جوانانِ پارسا — ہو زیرِ خاک گور و کفن وامصیبتا

اب کیا کہیں کہ غنچۂ تصویر بن گیا — کمہلا کے پھول سا وہ بدن وامصیبتا

ہم اور کنجِ ظلمتِ غم ہائے ہائے ہائے — وہ اور بندیل کھنڈ کا بن وامصیبتا

مل جائے خاک میں گہرِ اشک کی طرح — جوہر شناسِ حکمت و فن وامصیبتا

ہو قالبِ لحد میں نہاں روح کی طرح — پاکیزہ مثلِ روح وہ تن وامصیبتا

ناچار اس کے ساتھ کیا دفن خاک میں — دے حسرتوں کو کون کفن وامصیبتا

ہم خاک چھانتے ہیں مگر مل سکیں کہاں — وہ خال و خط وہ چشم و ذقن وامصیبتا

اے خاک سچ بتا تجھے سوپنے تھے کیا کیے — وہ قد و خد، وہ دست و دہن وامصیبتا

الٹا ہمیں پہ ٹوٹ پڑا غم کا آسماں — اے نالہ ہائے چرخ فگن وامصیبتا

رشکِ گلاب جس کا نموئے شباب تھا — ہو سوزِ تپ سے سوختہ تن وامصیبتا

پامال فوجِ مرگِ جگر حیف حیف | تاراج بادِ سروِ چمن وامصیبتا
مل کر لحد کی خاک میں خاکِ شفا ہوا | وہ عترتِ حسین و حسن وامصیبتا
وہ پائے بند صوم و صلوٰۃ آہ آہ آہ | وہ تابعِ کتاب و سنن وامصیبتا

ڈوبے ہوئے لہو میں ہیں اہلِ عزا تمام
پر خوں ہے کیا بیاں کا سخن وامصیبتا

﴿۲﴾

بروفات بابو محمد زکریا

ہے زکریا غضب تری افتاد ہائے ہائے | تو اور اجل کا ارّۂ بیداد ہائے ہائے
جھونکا تھا تند بادِ فنا کا فرس نہ تھا | اے بوئے گل کیا تجھے برباد ہائے ہائے
اُجڑے دلوں میں ہے تری صورت بسی ہوئی | کیوں ڈھونڈتی پھرے نہ تری یاد ہائے ہائے
کوکو برنگِ فاختہ کرتی ہیں بلبلیں | اے گلبن و صنوبر و شمشاد ہائے ہائے
یہ رشکِ مہر اور وہ پردہ زمین کا | روتے ہیں شاہدانِ پری زاد ہائے ہائے
کیا جانے دل پہ صورتِ گل کیا گزر گئی | کچھ غنچہ ساں کیا بھی نہ ارشاد ہائے ہائے
لپٹی ہوئی کفن میں تری حسرتیں بھی ہیں | مٹی میں وہ جمالِ خدا داد ہائے ہائے

ہر زخمِ ہجر ہے لبِ فریاد اے بیاں
اب بھولتا نہیں دلِ ناشاد ہائے ہائے

(لسان الملک، میرٹھ :مارچ، اپریل ۱۸۹۵ء)

﴿۳﴾

بروفات دخترِ منشی بالسروپ شکن

در پردہ نورِ چشمِ شکن وامصیبتا | آبِ رواں اور اس کا کفن وامصیبتا

ہو پارہ خار ماہیِ دریائے گنگ سے | وہ برگِ یاسمن وہ سمن وامصیبتا

اے شمع بزمِ والدہ جلتا ہے بن ترے | پروانہ تیرے رخ کا شکن وامصیبتا

اس برگ گل کو چھین لیا تیرے ہاتھ سے | کیوں اے نسیم صبح وطن وامصیبتا

اک دم پھر آ کے اے گل برباد دیکھ لے | اجڑا ہوا ہے تیرا چمن وامصیبتا

کانٹے چبھے ہوئے ہیں اس آغوش میں جہاں | جھڑتے ہیں پھول وقتِ سخن وامصیبتا

صد چاک مثلِ گل ہوا ماں باپ کا جگر | مرجھا گئی وہ غنچہ دہن وامصیبتا

کھایا نہ تو نے رحم کسی پر کبھی اجل | روتے ہیں مرد وکودک وزن وامصیبتا

مل جائے یوں وہ اخترِ تابندہ خاک میں | اے گردشِ سپہرِ کہن وامصیبتا

نقشِ قدم کی طرح ہزاروں مٹا دئے | کیا قہر ہے فلک کا چلن وامصیبتا

کامِ نہنگ مرگ میں وہ درِّ شاہوار | اے لطمۂ محیط زمن وامصیبتا

اس لختِ دل کے سوگ میں کیوں کر نہ ہو بیاں
وردِ زبان و کام و دہن وامصیبتا

سہرا

﴿۱﴾

جلوۂ شان کریمی کا ہے مظہر سہرا
پر تو نورِ الٰہی ہے سراسر سہرا

ہاتھ دادا کا ہے بنڑے ترے سر پر سہرا
اے ترا پنجۂ خورشید سے بہتر سہرا

نور ٹپکا کبھی رخ سے کبھی جوبن ٹپکا
چھا رہا ہے چمنِ حسن نکو پر سہرا

اڑ کے اب جائیں کہاں طائرِ دل مرغ نگاہ
گھات میں ہے تہہِ گلدام چھپا کر سہرا

دام صیّاد بنا دامن گلچیں بن کر
ڈالے ڈورا گل و بلبل پہ نہ کیوں کر سہرا

"دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدیم"
رُخ پُر نور ہے کندن تو ہے پُر زر سہرا

رحل ہو مصحفِ رخ کی ترے حافظ کی کنار
دم دعائیں یہی کرتا ہے جبیں پر سہرا

لپٹی ہیں تارِ نظر پر جو چچا کی نظریں
کس جھمکڑے سے بنا صبح مکرّر سہرا

خطِ گلزار میں کی زر سے رقم سورۂ نور
ورقِ مصحف عارضِ کا ہے اوپر سہرا

خوب تاریکی زمیں پر ہے یہ پھولوں کا فلک
کہ تلے عارضِ پُر نور ہے مسطر سہرا

لڑی قسمت گلِ رخسار سے رشتہ جوڑا
چمکا تارا کہ بنا صبح کا اختر سہرا

بوسے دیتا ہے جبیں پر کبھی رخساروں پر
زانکہ منظور نظر داشتہ ایں ہر سہرا

کبھی ہونٹوں کی نبات اور کبھی رخ کے جلوے
خوب گل چھرّے اڑاتا رہا شب بھر سہرا

مشک زلفوں میں ادھر پھول ہیں لڑیوں میں ادھر
رکھتا ہے حسن کے پلوں کو برابر سہرا

رُخ جو دولھا ہے تو شرمیلی جبیں ہے دلہن
کنگنا دولھا کا ہے دلہن کا ہے جھومر سہرا

چڑھ کے سر آئینۂ رُخ کی بہاریں لوٹیں
اللہ اللہ رے قسمت کا سکندر سہرا

گلِ رخ سیب ذقن غنچۂ لب نرگسِ چشم
چوتھی کھیلے نہ ترے حسن سے کیوں کر سہرا

گرمیِ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی
بن گئے رخ کی شعاعوں میں الجھ کر سہرا

حوروں نے نرگسی آنکھوں میں بٹھایا کہ بنا
پھیل کر نقشہ کے ڈورے ترے رخ پر سہرا

کیوں اسے طاق سے مسجد کے چھوا کر لاتے
کعبۂ ابروئے خوش خم کا ہے جھالر سہرا

ٹکٹکی خضر و مسیحا نے لگا رکھی ہے
حوریں لائی ہیں رگِ جاں میں پرو کر سہرا

دھوپ بنتا ہے کبھی چاندنی بنتا ہے کبھی
نور کی جانِ صباحت کا ہے پیکر سہرا

جلوہ ہے اس میں بیاں بنڑے نظام الدیں کا
کیوں نہ ہو نظمِ نظامی کے برابر سہرا

ذوق و غالب نہ سہی اب ہیں بیاں داغ و امیر
دیکھیں اس سہرہ سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

﴿۲﴾

کیوں نہ ہو جلوۂ فزائے رُخِ انور سہرا
مظہرِ نورِ خدا ہے ترا مظہر سہرا

روئے پرنور سے قسمت جو لڑی اک اک کی
بن گیا سلکِ گل و گوہر و اختر سہرا

گوندھیں آنکھوں سے نہ کیوں تارِ نظر حوروں کا
لایا فردوس سے گل پلکوں سے چن کر سہرا

جوہرِ حسن ہے لیکن نگہہِ شوق کی طرح
نکل آیا ترے آئینہ سے باہر سہرا

دولہا دلہن کی نگاہیں جو لڑیں خلوت میں
اور گوندھا گیا اک سہرے کے اندر سہرا

اے سعید ازلی ہے یہ قران السعدین
کیوں نہ ہو حسن سعادت کا ترے سر سہرا

صحبت نیک سے ہوتا ہے عیاں نیک اثر
کیوں نہ ہو روئے منوّر سے منوّر سہرا

کیوں نہ ہو دیکھنے والوں کا کلیجہ ٹھنڈا
ہے بتاثیر سحر حسن حسیں پر سہرا

بسکہ تھا شیفتۂ حسن شبِ عقد کے بعد
کوئے گیسو میں رہا بھیس بدل کر سہرا

بندھ گیا تارِ بیاں کی شکر افشانی کا
بن گیا چاشنیِ قندِ مکرّر سہرا

لطفِ خفی کا مقنع نورِ جلی کا سہرا ہے اقترانِ سعدیں آغا علی کا سہرا

ہے تار تار پردہ نورِ شعاع خور کا کب موتیوں کی لڑیاں اور ہے زری کا سہرا

اے معدنِ سیادت لالوں کے لال ہیں یہ پھر کیوں نہ سرخ رو ہو آلِ نبی کا سہرا

کیا تاج پر کھلا ہے کیا فرق پر کھلا ہے فرخندگی کا طرہ زیبندگی کا سہرا

ہیں پھول کھلکھلاتے پھولے نہیں سماتے تھا منتظر ازل سے ہاں اس خوشی کا سہرا

ہے مسندِ سلیماں یہ تختِ نو عروسی جمشید کی انگوٹھی بالِ پری کا سہرا

مانند مہرِ تاباں پہنا ہے سر سے پا تک روشن دلی کا جامہ روشن رخی کا سہرا

کیا لعل و زر کا طرّہ شمس و قمر کا طرّہ علم و ہنر کا طرّہ ہے آدمی کا سہرا

بارش سے اے بیاں تھی خاطر کو بیقراری
مقبول ہو الٰہی یہ سرسری کا سہرا



بیان میرٹھی کی مُہر کا عکس